بسم الله الرحمن الرحيم

Blank

تیسرا لاپتہ

مصنف

مجتبی رحماندوست

مترجم

ڈاکٹر سید کلیم اصغر

اسلامی کتاب گھر، دہلی و تکا توسعہ کتاب ایران

تیسرا لاپتہ

(فارسی افسانوں کا اُردو ترجمہ)

نام کتاب : تیسرا لاپتہ (مفقود سوم)

تصنیف : مجتبیٰ رحماندوست

مترجم : ڈاکٹر سیّد کلیم اصغر

صفحہ آرائی : خان محمد صادق جونپوری

ناشر : اسلامی کتاب گھر، دہلی وتکا توسعہ کتاب ایران

زیر نظر : مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی

سن اشاعت : ۱۴۳۳ھ ق/ ۱۳۹۰ھ ش/ ۲۰۱۲ء

ڈائنٹل : عائشہ فوزیہ

ناظر چاپ : حارث منصور

مطبع : الفا آرٹ، نوئیڈا (یو. پی.)

فہرست

- پیش گفتار ۷
- مؤلف ایک نظر میں ۹
- مقدمہ ۱۱
- تیسرا لاپتہ ۲۳
- زچہ خانہ ۴۰
- دولھا کی پھوپھی ۴۴
- آئیڈیل ۵۲
- خاک ۵۹
- کچھ اور انتظار ۶۶
- آرزو ۷۶
- آخری کارتوس ۸۷
- ماں ۹۳
- علی اکبر کی یاد میں ۹۷
- ٹیکسی ۱۰۴
- دو کبوتر ۱۰۸

- نومولود ۱۱۴
- عزاداری ۱۱۸
- زیارت ۱۲۴
- دعائے عہد ۱۲۹
- ڈیڑھ جوڑ ۱۳۴

پیش گفتار

مجتبیٰ رحماندوست انقلاب اسلامی ایران اور خاص طور سے دفاع مقدس سے متاثر مصنفین کی صف میں ایک اہم نام ہے۔راقم الحروف نے موصوف کے چند افسانوں سے متاثر ہوکر ضروری سمجھا کہ ان کا تعارف ہندوستانی ادب میں بھی کرایا جائے۔لہذا ان کی مشہور کتاب 'مفقود سوم' کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ترجمہ ایک مشکل کام ہے۔یہ صرف کام نہیں بلکہ ایک مستقل فن ہے۔اس فن کے ساتھ کتنا انصاف ہو پایا ہے یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑا جاتا ہے۔میری حتی الامکان کوشش یہ رہی ہے کہ مطالب کو آسان کرکے پیش کیا جائے اور اس کو آسان و سہل بنانے کے سلسلے میں بعض جگہوں پر لفظی ترجمہ تو کچھ مقامات پر مفہوم کا سہارا لیا جائے۔یوں تو ترجمہ کے سلسلے میں کتابی شکل میں میری یہ پہلی کوشش ہے۔امید ہے کہ آپ اپنے قیمتی مشوروں سے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

حق تلفی ہوگی اگر میں جناب ڈاکٹر علی رضا قزوہ ڈائرکٹر پرشین ریسرچ سینٹر ایران نئی دہلی کا شکریہ ادا نہ کروں جن کے مسلسل اصرار پر یہ علمی کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

میں نہایت ہی ممنون و مشکور ہوں اپنے مخلص ساتھی جناب پروفیسر عراق رضا زیدی سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کہ جنھوں نے ہمیشہ ہر قدم پر میری راہنمائی فرمائی اور اس علمی کارنامے کے سلسلے میں نہ فقط حوصلہ افزائی کی بلکہ پورے

متن کو بار بار پڑھ کر ترجمہ میں رہ جانے والے چند اشکالات پر نظر ثانی کر کے ان کو اپنے تجربے کے طور پر برطرف کیا اور مقدمہ لکھنے کی بھی زحمت اٹھائی۔

ناشکری ہوگی اگر اپنی شریک حیات ناہید زیدی کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے ترجمہ کرنے کے دوران اپنا پورا تعاون دیا۔ میرے بچوں سحر فاطمہ اور ایس ایم زین اصغر نے کمسنی کے باوجود کام کرنے کی لگن کو محسوس کرتے ہوئے اس دوران مجھے کسی طرح سے بھی پریشان نہیں کیا ورنہ اس کام کا پایہ تکمیل تک پہنچنا ناممکن تھا۔

ڈاکٹر سید کلیم اصغر
اسسٹینٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مؤلف ایک نظر میں

مجتبیٰ رحماندوست ۱۳۳۳ھ ش میں ایران کے مشہور و معروف شہر ہمدان میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ۱۳۵۱ھ ش میں ہمدان سے تہران منتقل ہو کر ڈاکٹر ہشترودی اسکول میں اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھایا اور نیشنل ٹیسٹ میں کامیاب ہونے کے بعد تہران یونیورسٹی میں انجینیرنگ آف آر کے ٹیکچر میں داخلہ لیا۔ ۱۳۵۸ھ ش میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے مجتبیٰ رحماندوست مندرجہ ذیل عہدوں اور مناصب پر فائز رہے:

مشیر ثقافتی و مشیر برای امور شہدا، صدر جمہوریہ ایران، ۷ ویں اور ۸ ویں دور میں۔

مشیر صدر جمہوریہ ایران، برای امور شہداء، ۹ ویں دور میں

ڈائرکٹر مرکز آفرینش ہای ادبی حوزہ ہنری (۱۳۸۰ھ ش سے ۱۳۸۵ تک)

ڈائرکٹر ورکشاپ آف قصہ و ناول (۱۳۷۲ھ ش سے ۱۳۸۰ تک)

ڈائرکٹر جنرل مرکز مطالعات و تحقیقات فرہنگی وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی (۱۳۷۵ھ ش سے ۱۳۷۶ تک)

وائس پریسیڈنٹ آف سوشل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن آف آرمی (۱۳۶۷ھ ش سے ۱۳۶۸ تک)

جنرل سکریٹری، دفاع ملت فلسطین کمیٹی (۱۳۸۰ھ ش سے اب تک)

چیف ایڈیٹر، روایت ایثار میگزین

ان کے علاوہ بھی بہت سے عہدوں پر فائز رہے۔ آج کل تہران یونیورسٹی تہران میں ریڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ فرہنگستان ہنر جمہوری اسلامی ایران کے ایک اہم رکن ہیں اور دفتر ادب و ہنر کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔

آپ کو اب تک کئی قومی اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ رحماندوست نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہر میدان میں شہرت پائی لیکن داستان نویسی آپ کا ایک اہم میدان ہے۔ یہاں ان کی چند علمی کاوشوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱۔ مسافر (داستان بلند)

۲۔ میل لیلی (داستان بلند)

۳۔ سفر غریب (سفرنامہ داستانی)

۴۔ سہ پدیدہ در آیینہ زمان

۵۔ روش نو در آموزش مبادی العربیہ

۶۔ مفتاح التفاسیر (کلید ۵۵ تفسیر شیعہ و سنی)

۷۔ تفاسیر قرآن کریم

۸۔ تفسیر بہ رای وغیرہ۔

مقدمہ

اللہ نے کائنات کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اپنی مخلوق کی تمام نیک ضروریات و خواہشات کو پورا کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ کلام کرنے کا سلیقہ عطا کیا۔ جس سے ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ مصیبتوں اور مشکلات میں ایک دوسرے کا سہارا بن سکیں۔ وقت گزارنے اور تندرستی بنانے کے لئے ورزش اور داستان سرائی کا ہنر عطا کیا۔ اتفاق یہ بھی ہوا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں عزازیل کو ابلیس کی شکل میں راندہ درگاہ کردیا گیا۔ اسی شیطانی وسوسہ نے انسانی نیک خواہشات وضروریات کو بدی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ جس میں کہیں کامیابی تو کہیں ناکامی ہاتھ آئی۔ داستان گوئی میں شیطانی کرداروں نے ٹریجدی کا عنصر پیدا کردیا اور پہلی داستان حضرت آدمؑ سے ہی شروع ہوگئی جس میں دور حاضر تک کی تمام ٹیکنک اور خصوصیات موجود ہیں۔ ایک دوامی ولن شیطان ہے تو وقتی ولن کا رول قابیل ادا کررہا ہے۔ اس طرح یہ داستان گوئی کا فن اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا حضرت نوحؑ اور ان کی قوم، حضرت ابراہیمؑ اور نمرود، حضرت موسیٰؑ اور فرعون، حضرت عیسیٰؑ اور یہود، حضرت محمدؐ اور ابوجہل، ابولہب و ابوسفیان، امام حسینؑ اور یزید یہاں تک کہ امام خمینی اور شاہ ایران و امریکہ کے دور سے گزر کر دور حاضر تک پہنچتا ہے۔ انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا اس منزل تک آ گیا کہ تمام دنیا کو انٹرنیٹ نے ایک گاؤں کی شکل میں تبدیل کردیا۔

فارسی زبان میں داستان گوئی کب اور کیسے شروع ہوئی یہ سب پردہ خفا میں ہے۔لیکن ابوشکور بلخی اور رودکی کی منظوم داستانیں اس فن کے عروج کی پہلی گواہ ضرور ہیں۔پھر شاہنامہ فردوسی اور خمسہ نظامی اور ان کی اتباعی مثنویاں منظوم داستان گوئی کی زندہ تاریخیں ہیں۔انیسویں صدی نے انسان سے وقت چھیننا شروع کیا یہاں تک کہ مشین کا استعمال کرتے کرتے وہ خود ہی مشین بن گیا۔اس سائنسی انقلاب اور جدید انسانی سوچ نے ادب کو بھی متاثر کیا۔داستان، ناول میں سمٹ گئی تو ناول یا رمان نے داستان کوتاہ کا جامہ پہن لیا جسے اردو میں افسانہ اور منی کہانی کا نام دیا گیا۔جس کی شروعات انیسویں صدی کے نصف آخر سے نظر آتی ہے۔جب short story نے مغرب سے مشرق میں قدم رکھا۔سنہ ۱۸۵۱، ۱۲۶۴ میں امیر کبیر نے دارالفنون کی بنیاد رکھی تو ایران کے ہر شعبہ زندگی میں انقلاب و ترقی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔یہی آہٹ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ایک بلند آواز بن کر مشروطیت کی شکل اختیار کرگئی۔داستان سرائی تفریح طبع کے لئے تھی تو مغربی افکار نے اسے زندگی سے جوڑنے کے وسیلے کا دعوی کیا حالانکہ تمام قرآنی داستانیں زندگی سے جڑی ہوئی بھی ہیں اور انقلابی کیفیت کی حامل بھی۔اسلامی انقلاب سے پہلے تک چاہے وہ داستان گوئی کی روایت رہی ہو یا رمان (ناول) اور داستان کوتاہ (افسانہ) کی روایت ان میں مضمون و مفہوم کے اعتبار سے کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔وہی عشقیہ داستانیں، جنگ میں جھونکنا اور قتل عام کی باتیں، کسانوں اور مزدوروں کی آوازیں بھی کہیں کہیں سنائی دیتی تھیں لیکن اسلامی پیکر میں ڈھلے ہوئے مضامین و مفاہیم کی کمی تھی جس کی بناپر مغرب کے اثرات ہمارے ذہن و دل میں کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر داخل ہورہے تھے۔اسلام دشمن ادیب و مفکر بڑی احتیاط اور شاطرانہ کاوشوں سے اپنا مغربی زہر ہم مشرقی سیدھے سادے عوام کے ذہنوں مین گھول رہے تھے۔وہ صرف اسلامی

روایتوں کا خاتمہ ہی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ مشرقی تہذیب و تمدن جس میں ہماری ہندوستانی مخلص و پائیدار روایتیں بھی تھیں کو بھی مٹانا چاہتے تھے۔شراب اور عریانیت کو عام کرنا ان کا اہم ہتھیار تھا جسے مشرق نے آسانی سے قبول کرلیا تھا لیکن اسلامی انقلاب کے بعد ایرانیوں نے اس سازش کو فورا تاڑ لیا اور انقلابی ادیبوں نے اپنی کاوشوں کے ذریعے ان تمام مغربی رجحانات و افکار کا، رد،اس دلچسپ انداز میں کیا کہ ایرانیوں کے ذہن و دل سے مغربی منفی افکار و خیالات کا نشہ آہستہ آہستہ اترنے لگا۔یہ کام نظم اور نثر دونوں میں یکساں طور پر انجام دیا جانے لگا۔داستان کوتاہ میں معاشرتی نظام کو اسلامی روایتوں اور پہلوؤں سے اجاگر کرنے کی کامیاب کوششیں ہوئیں۔ شہادت کے اصل مفہوم، مقصد، طریقے، امتیاز اور افکار پر روشنی ڈال کر،نام نہاد جدید مغربی افکار کو مٹا کر اسلامی افکار کو پروان پڑھانے کی کوششیں ہوئیں۔صدام کے غاصبانہ جذبے اور ایران پر تھوپی گئی جنگ نے اس ادیبانہ مہم کو اور مہمیز کیا۔جس کے نتیجہ میں مجتبی رحماندوست کی کاوش 'مفقود دسوم' سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔برصغیر میں ان افکار کو عام کرنے کا سہرا سید کلیم اصغر کے سر رہے گا۔جنھوں نے پہلی بار فارسی کے اس ادیب و دانشور کے خیالات کو عام کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ترجمہ کا فن کتنا مشکل ہے اس بات کا اندازہ صرف مترجم یا کئی زبانوں پر دسترس رکھنے والے دانشور ہی کرسکتے ہیں۔ ہر زبان کے الفاظ کا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔اسی طرح با محاورہ زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں رائج محاوروں کے ذریعے ہی کیا جانا چاہئے۔محاوروں کے ترجمے کا کوئی رشتہ الفاظ سے نہیں ہوتا۔مثلا سر از جیب،آستین، گریبان برآوردن کی جگہ اردو میں صرف برابری کرنا استعمال ہوتا ہے۔جس کے لفظی معنی کسی صورت نظر نہیں آتے۔یہی حال ضرب المثل کا بھی ہے۔ جس کے ترجمے میں الفاظ کے معنی و مفہوم کا دور کا رشتہ بھی نہیں دکھائی دیتا۔مثلا

انگریزی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے Tit for tat جس کا ترجمہ 'جیسے کو تیسا' ہوتا ہے۔ ابھی تک فارسی کے معمولی الفاظ ساقی، جام، مرشد وغیرہ کے لئے بھی انگریزی زبان میں کوئی متبادل الفاظ نظر نہیں آتے۔ غرض کہ ترجمہ کی نزاکتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سید کلیم اصغر کے ذریعہ فارسی زبان کی کاوشوں کا اردو زبان میں کئے گئے ترجمہ کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مجتبیٰ رحماندوست انقلاب اسلامی کے مجاہدین میں سے ایک ہیں۔ امام خمینی کے افکار و خیالات سے ہم آہنگ ان کی شخصیت اس انقلاب کو قائم و دائم رکھنے میں زور قلم و السیف کی حامل ہے۔ وہ میدان جنگ کے شہسوار رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر جنگ کی تباہیوں، جنگ میں شہید ہونے والوں اور ان کے احباب و خاندان والوں کے دلوں کی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ ایک ماہر علم نفسیات کی طرح بچوں، جوانوں اور بزرگوں کی نفسیات سے خوب واقف ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کے تجربے، مشاہدات اور نفسیات کا عمل ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ جہاں چاہتے ہیں وہاں افسانوں میں بھی ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ جاندار مکالموں کی مدد سے وہ قاری کا ذہن ان مناظر تک پہنچادیتے ہیں جہاں خود اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی شہادت کے جذبے سے سرشار ہے۔ ان کی کہانیاں ایک بودے اور ڈرپوک انسان میں بھی جوش و ولولہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کلیم اصغر نے ان سبھی پہلوؤں کو نظر میں رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ ترجمے میں بھی وہی کیفیت اور طاقت برقرار رہے جو اصل عبارت میں ہے۔

اس ذیل میں پہلا افسانہ 'تیسرا لاپتہ' جو ایک ایسی ماں کے گرد گھومتا ہے جس کے دو بچے جنگ کی نذر ہو چکے ہیں لیکن ان کی لاشیں نہیں مل سکی ہیں۔ ماں کو گمان ہے کہ بچے دشمن کی قید میں ہیں اور ایک نہ ایک دن ملنے ضرور آئیں گے۔ اس کا تیسرا

بیٹا جذبہ شہادت سے سرشار ہے اور چاہتا ہے کہ وہ بھی بھائیوں سے جا ملے۔مگر ماں اسے لاپتہ ہوجانے کے ڈر سے اجازت نہیں دیتی۔آخر کار وہ اس وعدے کے ساتھ اجازت لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ وہ یا تو شہید ہوگا یا واپس آئے گا۔لاپتہ نہیں ہوگا۔ یہاں مجتبیٰ رحماندوست قاری کے جذبہ شہادت کو بیدار کرنے میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔اس کہانی کا پڑھنے والا اس وقت کی آٹھ سالہ جنگ میں شرکت کے لئے بیتاب ہوسکتا ہے۔تیسرا بیٹا شہید ہونے کے بعد لاپتہ تو نہیں ہوتا لیکن افسانہ نگار نے کلائیمکس کا ایک نیا انداز ایجاد کیا ہے۔شہید مرتا نہیں زندہ رہتا ہے اس حقیقت کے تحت یہ کردار شہادت پا کر بھی اپنی ماں سے کئے ہوئے وعدے کی فکر میں اس طرح مبتلا ہے:

اما نگرانی جدیدی وجودم را پر می کند. وقتی می خواستند پیکرم را از زیرسقف فروریخته سنگر بکشند، پلاکم گیر کرد و زنجیرش کنده شد. برادران هم رزمم هم نفهمیدند. من هم که نمی توانستم به آنها بگویم. ساعتها بود زبان گفتگوی من با یاران دنیایی ام بسته شده بود. گوئی سالهاست وارد دنیای جدیدی شده ام. همان لحظات اولیه محمّد حسن و حمید برای خوش آمد گوئی آمدند. چه قدر دلم برایشان تنگ شده بود. گفتم ای کاش می توانستم به مادر خبر بدهم که منتظر دو مفقودش نباشد. آنها شهیدند و حالا سه نفری باهم یک گروهان شهید را تشکیل داده ایم.

لیکن ایک نئی پریشانی میرے وجود کو فکر میں ڈال دیتی ہے۔جس وقت کارکنان میرے بے روح جسم کو کھنڈروں سے باہر لانا چاہتے تھے میرا شناختی کارڈ وہیں رہ گیا یہاں تک کہ اس کی زنجیر بھی ٹوٹ کر گر گئی اور کوئی

اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔لیکن اپنی بات کہنا میرے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔میری زبان دنیاوی دوستوں کے لئے بند ہو چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ برسوں قبل میں ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکا ہوں۔جیسے ہی میں نے اس دنیا میں قدم رکھا سب سے پہلے میرے شہید بھائی محمد حسین اور حمید میرے استقبال کے لئے بڑھے۔میرا دل ان دونوں سے ملنے کے لئے کتنا بے قرار تھا۔میں نے کہا کاش ایسا ہوتا کہ میں اپنی ماں کو یہ خبر پہونچا سکتا کہ وہ اپنے دونوں گم شدہ بیٹوں کا انتظار نہ کرے۔وہ شہید ہیں اور اب ہم تینوں بھائیوں نے مل کر ایک شہیدوں کی انجمن تیار کر لی ہے۔

کہانی کے آخر میں ان تینوں شہیدوں کی ماں اپنے بیٹے کو پہچان کر بھی دوسرے شہید کی ماں کا دل رکھنے کے لئے بیٹے کا دعوی چھوڑ دیتی ہے۔اور ہر سال اسی زمانے میں بیٹے کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتی ہے۔جب اس قبرستان میں زائروں کی بھیڑ نہیں ہوتی۔یہ ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار کرنا ہی اس افسانہ اور افسانہ نگار کی زندگی ہے۔

ایک دوسرا افسانہ 'زچہ خانہ' ہے۔جس میں زخمیوں کی تعداد حد سے تجاوز کر جانے کی بنا پر ہر اسپتال کے دروازے جنگی زخمیوں کے لئے کھول دئے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ وہ زنانے اسپتال بھی جو زچہ بچہ کے لئے مخصوص ہیں وہاں بھی ان جنگی زخمیوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ایسے ہی ایک اسپتال کا منظر ایک زخمی کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے جو زچہ بچہ وارڈ میں بھرتی کر دیا جاتا ہے۔یہیں اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی نے بھی اس کے ایک بیٹے کو اسی اسپتال میں جنم دیا ہے۔یہ افسانہ رنج و انبساط کا انوکھا امتزاج ہے۔جہاں نام کے ادھورے حصے کی بنا پر نرسیں کسی بچے کو دودھ پلانے کے لئے اس جنگی زخمی کے پاس لے آتی ہیں جو اتفاق سے اسی کا بیٹا ہے۔

من دو ماهی می شد که به منطقه رفته بودم و همسر باردار خودم را در منزل باقی گذاشته بودم و در جبهه از او بی خبر بودم. روز قبل او را از شهر محل سکونتم،یعنی رزن، به همدان منتقل کرده بودند و درهمان زایشگاه، بستری شده بود. در واقع شب قبل از بستری شدن من در زایشگاه خداوند به من پسری داده بود وخودم خبر نداشتم. این بار این پسر خودم بود که به اتاقم می آوردند تا شیرش بدهم. توسّط یک قاصد به همسرم خبر دادم که من هم درهمین زایشگاه بستری هستم. دو روز بعد من وهمسرم همراه آقا صادق جدیدمان از زایشگاه ترخیص شدیم.

میں دو مہینے سے جنگ پر گیا ہوا تھا اور میری حاملہ بیوی گھر پر تھی۔ جب سے میں گیا تھا گھر سے کوئی خیر و عافیت نہیں ملی تھی۔ ایک دن پہلے اس کو اپنے شہر یعنی رزن سے ہمدان منتقل کر کے اسی اسپتال میں داخل کردیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے اس اسپتال میں داخل ہونے سے قبل والی رات کو خداوند عالم نے مجھ کو ایک بیٹا عطا کیا تھا جس کی مجھ کو بھی خبر نہیں تھی۔ اس بار یہ میرا ہی بیٹا تھا کہ جس کو میرے پاس لایا گیا تا کہ اسے دودھ پلادوں۔ قاصد کے ذریعے بیوی کو خبر دی کہ میں بھی اسی اسپتال میں ہوں۔ دو دن بعد میں اور میری شریک حیات اپنے ننھے بیٹے صادق کے ساتھ اسپتال سے چھٹی پا کر رخصت ہو گئے۔

'دولھا کی پھوپھی' افسانے میں شہید کے جنازے کی کیفیت اور دفن ہونے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ جس میں دولھا کی پھوپھی کی نظر میں شادی کے انتظامات

شہید کے دفن سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔شہید بھی ایسا کہ جس کا جنازہ مدت کے بعد اس کے شہر میں لایا گیا ہے۔اس کے علاوہ دولھا، دلہن دونوں طرف کے اعزا یہ پروگرام ملتوی کرنے پر متفق ہوجاتے ہیں۔لیکن شہید اپنی حکمت عملی سے پھوپھی کو قائل کرلیتا ہے اور وہ توبہ و استغفار میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔اس افسانے میں شہید کی اہمیت اس کے دفن کو ہر دنیوی کام پر فوقیت اور اس کے زندہ ہونے کی علامت بیان کر کے عوام کے جذبہ شہادت کو ابھارا گیا ہے، جس کا اختتام پھوپھی کی زبانی اس طرح ہوتا ہے:

کلیم اصغر نے اس منظر کو بھی اپنے ترجمہ کے ذریعے من وعن بیان کردیا ہے کہ مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی:

فکر کردم که دیگر کارم تمام است. چون تاتلاش کردم که از باتلاق بیرون بیایم،تا سینه در آن غرق شده بودم. بی اختیار فریاد زدم و کمک خواستم تا کسی مرا نجات دهد. آقای خوش سیمائی دستش را دراز کرد و گفت: "دست مرا بگیر و بیرون بیا. دستم که به دست او رسید احساس آرامش کردم. او به تدریج مرا از باتلاق بیرون کشید و از مرگ حتمی نجاتم داد. پرسیدم شما کیستید؟ گفت من همان چهار تااستخوانم. من شهید حاج حسن هستم".

میں نے سوچا کہ اب میرا کام تمام ہونے والا ہے جب میں نے کوشش کی کہ تالاب سے باہر آؤں،تو سینے تک غرق ہوچکی تھی۔میں نے بے ساختہ فریاد کی تا کہ کوئی مجھے بچالے۔ایک نہایت حسین وجمیل شخص نے ہاتھ

بڑھایا اور کہا میرا ہاتھ پکڑو اور باہر آجاؤ۔جب میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پہنچا تو راحت محسوس کی اس شخص نے آہستہ آہستہ مجھ کو تالاب سے باہر نکالا اور یقینی موت سے نجات دلائی۔

میں نے پوچھا: ''آپ کون ہیں؟'' جواب دیا: ''میں وہی چار رہڈیاں یعنی شہید حاجی حسن ہوں''۔

'آئیڈیل' افسانے میں افسانہ نگار نے شہید ہونے کی عجیب خواہش ظاہر کی ہے اور اپنی اس خواہش کے ذریعے امام خمینی کی روحانی شخصیت کا اعتراف بھی کرایا ہے۔ایرانی بچوں اور جوانوں کے جوش شہادت سے بڑھ کر عجیب وغریب شہادتی فلسفے پر بحث کی گئی ہے۔امام خمینی خود اس خواہش پر حیران و پریشان ہیں جب ایک کمانڈر دیر سے شہید ہونے کی بنا پر اپنی شہادت ذبیحے کی شکل میں دینا چاہتا ہے جس کے لئے وہ امام سے ضد کرتا ہے۔یہاں مجتبیٰ رحماندوست نے دونوں کی نفسیاتی کیفیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی امام خمینی کی رضا کے سائے میں ذبیحہ کی طرح شہادت پانے پر افسانے کا اختتام ہوجاتا ہے:

از من اصرار از امام انکار. اما من آن قدر تکرار کردم که در لحظه ای احساس کردم که دل امام راضی شد و با نگاهش به من فهماند که قبول. می گوید دعا کن قسمتم شود. می گویم خوش بحالت. تو دیگر کی هستی. هنگامی که بالای سر او می رسم که می بینم به پهلو افتاده است و از گلویش خون می رود. صدای خر خر از گلویش در می آید. دست و پا می زند. بال می زند، بال می زند، پرو بال می زند تا به آسمان پرواز می کند. یک ترکش بزرگ خمپاره

گلوی او را هدف قرار داده و شکاف بزرگی در آن ایجاد کرده است و او خاموش می شودتا پرواز خود را آغاز کند.

میری طرف سے اصرار اور امام کی جانب سے انکار۔لیکن میں نے اس چیز کو اتنی بار تکرار کیا کہ ایک سیکنڈ بعد میں سمجھ گیا کہ امام کا دل راضی ہوگیا اور انہوں نے بھی اپنی نظروں سے سمجھادیا قبول''۔

اس نے کہا:''دعا کرو میری قسمت میں بھی ہو''۔میں نے کہا:''مبارک ہو تم کون ہو؟''

جس وقت میں اس کے سرہانے پہنچا،کیا دیکھا پہلو کے بل پڑا ہے اور گلے سے خون جاری ہے خرخر کی آواز اس کے گلے سے نکل رہی ہے ہاتھ پیر مار رہا ہے، پھڑ پھڑا رہا ہے اور پر و بال والے پرندے کی طرح تڑپ رہا ہے۔گویا کہ آسمان میں اڑنے کے لئے تیار ہے۔ایک بڑا تیر آیا اور اس کے گلے سے پار ہوکر نکل گیا۔اور ایک بڑا شکاف ہوا مصطفیٰ خاموش ہوا تا کہ وہ مائل پرواز ہو سکے۔

'خاک وطن' افسانے میں الجزائر کی تحریک آزادی اور فرانسیسیوں کے ظلم و استبداد کا حال بیان کیا گیا ہے۔جس کا اختتام سرکوزی نامی ایک کمانڈر کے آزاد الجزائر سے گلدان لے جاتے ہوئے کسٹم آفیسر کے ذریعے گلدان کے پھولوں میں اٹی ہوئی الجزائر کی خاک کو جھاڑ کر الجزائر کی مٹی کو دوبارہ فرانس تک پہنچنے سے روکنا ہے۔

'کچھ اور انتظار' میں ایک ایسی ماں کی کہانی ہے جو اپنے شہید بیٹے کی لاش کا انتظار کر رہی ہے۔اس کا شوہر اور بیٹا ہار مان چکے ہیں۔لیکن وہ جب بھی شہدا کی لاشیں آتی ہیں ان میں اپنے بیٹے کو تلاش کرنے پہنچ جاتی ہے۔یہاں تک کہ وہ اس کام میں ملک الموت سے بھی وقت مانگ لیتی ہے اور جب وہ اپنے بیٹے کی لاش کو

دیکھ لیتی ہے تو ملک الموت اس کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

'آرزو' افسانے میں پرانی اور نئی روایات و خواہشات کا ٹکراؤ ہے۔ ایک باپ ہے جو مغرب نواز ہے۔ اس کا بیٹا وطن پرست اور امام خمینی کا دلدادہ ہے۔ جس کی آرزو محاذ جنگ پر جا کر شہید ہونے کے ساتھ ہی مغرب زدہ ماں باپ کے ہاتھوں دفن نہ ہونے کی بھی ہے جو انقلاب اور امام خمینی کی اسلامی تحریک کا مخالف ہے۔

اسی طرح 'آخری کارتوس' ہمت اور ولولے کی داستان ہے تو 'ماں' ایک ایسے شہید کی ماں کی کہانی ہے جو اپنے شہید بیٹے کے جنازے کو تلاش کرتی ہوئی مدت بعد اپنی منزل تک پہنچتی ہے اور اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے شہید بیٹے نے خود کہا: ماں

'بیاد علی اکبر' ایک ایسے شہید کے والدین کی دل کو چھونے والی داستان ہے جو جنگ کے دوران ایک محاذ پر برف کے طوفان میں گھر کر شہید ہو جاتا ہے تو اس کے ماں باپ ہمیشہ ٹھنڈ میں زندگی گزارتے ہیں اور سردی میں بخاری یا کسی گرم کرنے والی چیز کا استعمال نہیں کرتے اور اپنے شہید بیٹے علی اکبر کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔

افسانہ 'ٹیکسی' تصور کربلا کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس افسانے میں عزاداران امام حسینؑ کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جس میں کوئی عزادار بہ حالت مجبوری گھر سے دور لندن جیسی جگہ میں ہوتا ہے۔ اسے ٹیکسی میں ایک نوحوں والا کیسٹ سن کر بڑا سکون ملتا ہے۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور اسے بتاتا ہے کہ ایک انگریز نے حضرت علیؑ کا نام اس تمغے پر دیکھ کر آگے کی سیٹ شراب کی حالت میں ہونے کی بنا پر احتراما چھوڑ دی تھی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ڈرائیور نے اس سے کرایہ بھی نہیں لیا تھا۔

غرض کہ ایسے ہی پاکیزہ اور نیک جذبات کے پاسدار خیالات پر مبنی داستان ہای کوتاہ کا یہ مجموعہ برصغیر میں اردو افسانہ لکھنے والوں کو خصوصا اور پڑھنے والوں کو عموما مغربی افکار سے ہٹ کر بھی ادب کی خدمت کرنے کے جذبے کو بیدار کرنے کے لئے

مہمیز کرے گا۔ جسے مجتبیٰ رحماندوست نے جتنی ہنرمندی اور افسانہ لکھنے کی کامیاب ٹیکنیک سے سپرد قلم کیا ہے۔

اسی تن دہی سے اپنی بھرپور ادبی کاوشوں کو بروئے کار لاکر سید کلیم اصغر نے ترجمہ کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس کی پذیرائی کرتے ہوئے فارسی کے دوسرے افسانوی مجموعوں کا بھی برصغیر میں تعارف کرائیں گے۔ جو ایک نئی مشعل اور انقلاب کا باعث بن سکتے ہیں۔

پروفیسر عراق رضا زیدی

سابق صدر شعبہ فارسی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

تیسرا لاپتہ

حبیب نے پوچھا:

''اس ماں کی داستان سنی ہے؟''

میں نے جواب دیا:

''نہیں کس ماں کی؟''

حبیب نے کہا:

''جس کا شوہر بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔اس کے تین بیٹے تھے جن میں سے دو لاپتہ ہو چکے تھے''۔

میں نے پوچھا:

''کس طرح؟''

اس نے جواب دیا:

''جنگ میں''۔

میں نے سوال کیا:

''کیا اس کے دو بیٹے شہید ہوگئے تھے؟''

حبیب نے جواب دیا:

''شہید کیسے کہوں۔کسی کو کچھ پتہ نہیں۔یہی تو مشکل ہے''۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حبیب کی مراد مشکل سے کیا ہے۔کونسی مشکل۔

میں نے حبیب سے کہا:

''تم نے ابھی جس مشکل کا ذکر کیا تھا اس سے مراد کیا ہے؟''

حبیب نے جواب دیا:

''اس کے دو بیٹے جنگ میں لاپتہ ہوگئے۔ایک دوسرے سے ایک سال کے فاصلے پر۔اب تین سال ہوگئے کہ وہ ان دو گمشدہ بچوں کی ماں ہے اور تب ہی سے اس کی نگاہیں انتظار میں دروازے پر لگی ہوئی ہیں!حمید اور محمد حسین کے لئے۔جب کہ حمید کے لئے چار سال سے بے چین ہے''۔

میں نے کہا:

''یہ بڑی مصیبت ہے خدا اس کو صبر عطا فرمائے''۔

اس نے کہا:

''تم لاپتہ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟''۔

''کیوں نہیں سمجھتا۔یعنی جس پر قطعی حکم صادر نہ ہوسکتا ہو کہ وہ شہید ہوگیا ہے یا کہ قیدی بنالیا گیا ہے''۔

''بس اتنا ہی؟''۔

''کیا کوئی کمی رہ گئی''۔

''اگر تم دو گمشدہ بیٹوں کی ماں ہوتے تو سمجھتے''۔

''صحیح کہا۔بہت مشکل ہے''۔

حبیب نے کہا:

''جیسے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔پہلا خیال۔خیال نہیں، پہلی امید، امید بھی نہیں بلکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ یا محمد حسین ہے یا حمید۔یا دونوں

ایک ساتھ گھر کا نمبر ملا رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ دونوں اتنے لاپرواہ بھی نہیں ہیں کہ تین چار سال مجھے اپنے آپ سے بے خبر رکھیں اور میری احوال پرسی تک نہ کریں۔ ان کو معلوم ہے کہ میں بغیر ان کے بے روح جسم کے مانند ہوں۔ یقیناً اس بار یا وہ دونوں خود ہیں یا کم از کم ان میں سے ایک ضرور ہے کہ جو فرصت پاتے ہی گھر کا نمبر ملا رہا ہے تا کہ مجھے اس پریشانی سے نجات دلائیں"۔

میں نے حبیب سے کہا:

"اس چیز کو تم نے خود اس سے سنا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "نہیں"۔

میں نے کہا:

"کیا تم علم غیب رکھتے ہو؟"

حبیب نے جواب دیا:

"اگر تمہاری بھی دادی ہوتیں کہ جس کا بیٹا جنگ میں گم ہو جاتا اور میری طرح ان کے گھر آمد و رفت کا سلسلہ ہوتا اور جتنی مرتبہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی تو اس وقت دیکھتے کہ کس طرح اپنے عزیز کی آواز سننے کے لئے دوڑ کر ریسیور اٹھاتی ہیں، تب اس احساس کو اچھی طرح سمجھتے"۔

میں نے کہا:

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ واقعاً بہت مشکل ہے۔ اچھا ہوا کہ ہم ماں نہیں ہوئے"۔

اس نے کہا:

"صرف ٹیلیفون ہی نہیں جب بھی دروازے کی گھنٹی بجتی ہے دل ہی دل میں اطمینان کے ساتھ بدبداتی ہے کہ اس مرتبہ وہ خود ہی ہے۔ میں نے

اس کے کپڑے دھو کر تیار کر لئے ہیں تا کہ آتے ہی نہانے کے لئے حمام میں بھیجوں۔نہیں بہتر یہ ہے کہ پہلے میں اسی پسینے والے بدن اور چپچپے لباس کے ساتھ اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر خوب پیار کروں، خوب پیار کروں اور اس سے پوچھوں کہ یہ وقت تم نے کس طرح گزارا۔نہیں جلدی کیا ہے۔ٹھیک ہے پہلے نہا دھو کر صاف ستھرا ہونے دو،اس کے بعد پھر اطمینان سے پوچھوں کہ کس مصیبت میں گرفتار تھے۔ وائے اے میرے خدا دیکھو بیٹا دروازے پر انتظار کر رہا ہے اور میں اس فکر میں ہوں کہ وہ پہلے حمام جائے یا نہیں۔آئی۔پیارے بیٹے آئی افسوس"۔

میں نے حبیب سے کہا:

"خدا ان ماؤں کے دلوں کی فریاد سنے، یقیناوہ خود جانتا ہے کہ ہمارا حوصلہ اور ہماری قوت ماں بننے کے لائق نہیں ہے"۔

اس نے کہا:

"لوگوں کی صبر کی طاقت محدود ہے اور حدود کے دائرے میں ہے۔اب اس ماں کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہونے کو ہے"۔

میں نے پوچھا:

"اس چیز کو تم نے کیسے محسوس کیا؟"

"اس طرح کے اب تیسرے بیٹے کو میدان میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔

ناصر نے کہا:

"ماں تم کس طرح برداشت کروگی کہ میرے دو بھائیوں کی بندوق میں زنگ لگ جائے"۔

ماں نے جواب دیا:

''حمید او رمحمد حسین میدان جنگ میں ہیں ان کی بندوقوں میں زنگ کیسے لگ سکتی ہے''۔

ناصر نے پوچھا:

''ماں اگر وہ جنگ میں ہیں تو ہماری اور تمہاری خبر کیوں نہیں لیتے ہیں''۔

ماں ان دونوں کی طرف سے بولتی ہے:

''برا گمان نہیں کرنا چاہئے، تمہارے دونوں بھائی کسی مشکل میں گرفتار ہیں وقت نہیں مل پارہا ہے کہ ماں کی خیریت لے سکیں''۔

''لیکن ماں آپ کو معلوم ہے کہ دونوں لاپتہ ہیں''۔

''نہیں بیٹے جلد ہی ان کا خط میدان جنگ سے آئے گا۔ مجھے پڑھ کر سنانا کہ ان پر کیا بیتی ہے''۔

''لیکن مجھے بھی جنگ کرنے جانا ہے''۔

''کوئی ضرورت نہیں، تم ابھی چھوٹے ہو۔کیا حمید او رمحمد حسین کے قد و قامت کو بھول گئے''۔

''میں بھی جنگ کرسکتا ہوں، سترہ سال کی عمر کم نہیں ہے''۔

''میدان جنگ کو تمہارے جیسے نوجوانوں کی ضرورت نہیں ہے''۔

''جنگ کو میری ضرورت نہیں لیکن مجھے جنگ کی ضرورت ہے''۔

''بس، مجھ سے بحث نہ کر۔میری آنکھوں کو نہیں دیکھتا کب سے دروازے پر لگیں ہوئی ہیں یہاں تک کہ سفید ہوگئیں''۔

''لیکن مادر گرامی یہ سچ ہے کہ بھائی حمید اور بھائی محمد حسین اس دنیا میں آپ کی شفاعت کریں گے''۔

''کہتے ہیں شہید شفاعت کرتا ہے، لیکن تمہیں کیسے معلوم کہ تمہارے دونوں بھائی شہید ہو گئے ہیں''۔

''تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان دونوں کو تلاش کروں''۔

''تم اس گھر کے اکلوتے مرد ہو۔تمہارے والد تو مرحوم ہو گئے۔میں نے تمہیں اور تمہارے بھائیوں کو کتنی مشکلوں سے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اگر تم ماں ہوتے اور تمہارے دو بیٹے کھو جاتے تو کیا تم تیسرے بیٹے کو میدان جنگ میں جانے کی اجازت دیتے؟''

''ہاں دے دیتا''۔

''کہنا آسان ہے''۔

''اس بات سے خوش نہیں ہو کہ زیادہ ثواب حاصل کرو اور خدا سے زیادہ قریب ہو''۔

وہ پہلی یا آخری ماں نہیں جو اپنے سترہ سالہ بیٹے کی حکیمانہ باتیں سن رہی ہے۔ گذشتہ سالوں میں اس جنگ نے نہ جانے کتنے لوگوں کی تربیت کی ہے کہ بنا پڑھے لکھے عارف اور فلسفی بن گئے اور ایک رات میں سو سال کا راستہ طے کر لیا ہے۔

ماں نے کہا:

''پیارے ناصر میں جانتی ہوں، لیکن اس گھر میں سوا تیرے کوئی دوسرا دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے''۔

ناصر نے جواب دیا:

''اس طرح کے گھروں کی خود خدا کفالت کرتا ہے اور خاص طور سے اس گھر کی جس میں تین شہیدوں کی ماں زندگی بسر کر رہی ہو''۔

ماں نے کہا:

''تم تو ابھی میدان میں گئے ہی نہیں تم کہاں سے شہید ہو گئے؟''

ناصر نے جواب دیا:

''آپ کے دو شہید بیٹوں نے بلایا ہے''۔

''اپنی زبان بند کر۔وہ لوگ لاپتہ ہو گئے ہیں۔شاید کل ہی واپس آجائیں''۔

''ٹھیک ہے، پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے جا کر ملوں اور کل واپس آجاؤں''۔

''میں تیسرے بیٹے کے لاپتہ ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتی''۔

''ٹھیک ہے لاپتہ نہیں ہوں گا''۔

''پھر کیا ہو گے؟''

''خدا جانتا ہے۔اگر شہید ہو گیا تب تو کوئی بات ہی نہیں۔تم نے کہا کہ انتظار کرنا بہت مشکل ہے۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ لاپتہ نہیں ہوں گا''۔

حبیب نے کہا:

''ماں ہرگز اس بات پر راضی نہیں تھی کہ ناصر کو جنگ کی اجازت دے کیونکہ وہ لاپتہ ہونے سے بہت ڈرتی ہے''۔

ماں کہتی ہے:

''دو پھول سے بیٹوں کا غم برداشت کیا اور پاگل نہیں ہوئی، یہی کیا کم ہے، اب تیسرے کے غم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتی''۔

حبیب کہتا ہے:

''ناصر کی زبان بڑی میٹھی ہے، ماں کی نبض اس کے ہاتھ میں ہے۔وہ بار بار علی اکبر اور علی اصغر کے بارے میں بات کرتا ہے، رباب اور زینب

مصیبتوں کا ذکر کرتا ہے یہاں تک کہ ماں کا دل نرم ہوجاتا ہے، یہ سب باتیں ناصر نے محرم اور صفر کی مجلسوں میں سنی تھی۔ماں ایک شرط رکھتی ہے''

''تم کو لاپتہ ہونے کا حق نہیں''۔

ناصر وعدہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

''خدا کو کیا مشکل ہے کہ میرے قول کو عملی جامہ نہ پہنائے۔میں وعدہ کرتا ہوں لاپتہ نہیں ہوں گا''۔

ماں کا دل اس بات پر راضی نہیں کہ ناصر کی بات مان لے۔

ماں کہتی ہے:

''تم تو کہتے ہو خدا کے ہاتھ میں ہے،اب کیسے پتہ چلے کہ تم بھی اپنے دونوں بھائیوں کی طرح لاپتہ نہیں ہوگے۔نہیں نہیں میرا حوصلہ جواب دے چکا ہے''۔

ناصر نے کہا:

''لیکن ماں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جب میں نے قول دے دیا کہ گم نہیں ہوں گا تو نہیں ہوں گا''۔

ماں کہتی ہے:

''پھر کیوں حمید اور محمد حسین کا کوئی پتہ نہیں ہے''۔

''ان لوگوں نے وعدہ نہیں کیا تھا''۔

''دونوں کا کیا تعلق ہے۔یہ باتیں انسان کے وعدے سے متعلق نہیں ہیں''۔

ناصر دل ہی دل میں سوچتا ہے: ''اس وقت زیادہ بحث کرنے کا موقع نہیں ہے اور ماں کے رنجیدہ دل کو اور رنجیدہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔لیکن کیا کروں میرے لئے یہ بات مسلم ہے کہ شہید کے قول کی خدا ضمانت لیتا ہے۔اگر شہید نہیں ہوا اور واپس

آ گیا تو لاپتہ نہیں ہوں اور اگر شہید ہوگیا تو میرا وعدہ سچا ہے اور اس کا ضامن خدا ہے"۔

ناصر ابھی تک جنگ کے لئے نہیں گیا تھا، لیکن دوسرے سترہ سالہ عارفوں کی طرح جو اس زمانے میں زیادہ ہوگئے ہیں اس طرح کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہتا ہے: کیا ہمارے استاد مصطفیٰ کلہری نے خدا سے نہیں چاہا تھا کہ ان کی شہادت قربانی کے ذبیحہ کی طرح ہو۔ کلہری نے کہا تھا میں اپنے محلّہ کی شہدا کی ماؤں کو دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہوں اور زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کو اچھا نہیں سمجھتا اور زیادہ زندہ رہنے سے بیزار ہوں۔ انہوں نے خدا سے دعا کی تھی کہ میری دیر سے شہادت کا بدل قربانی کے ذبیحہ کی طرح ہو اور عجیب بات ہے کہ جس وقت ان کے جنگ کے ساتھی برادر موحدی نے خبر دی کہ جنگ کے دوران میں ان کے پاس تھا کہ ایک بڑا تیر آیا اور ان کی گردن میں پیوست ہوگیا اور وہ زمین پر گر گئے، گلے سے شدت کے ساتھ خون جاری ہوا، تھوڑی دیر کے لئے گوسفند ذبح کرتے وقت کی آواز سنائی دی، ہاتھ پاؤں پھڑ پھڑائے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔

ناصر خود اپنے آپ سے کہتا ہے: تہران یونیورسٹی کے شہید زمین چمن کی داستان یا اس بہادر سپاہی کی شہادت کی داستان کی طرح جس کا تعلق ایک مالدار اور انقلاب مخالف خانوادہ سے تھا اور اس کی یہ خواہش کہ کوئی بھی انقلاب کا مخالف چاہے وہ اس کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اس کے جنازے میں شرکت نہ کرے۔ یا اس شہید بے سر اور... کہ خداوند عالم نے ان تمام لوگوں کی آرزو شہادت کے سلسلے میں پوری کی۔ ان سب باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا کہ اگر شہید ہوگیا تو میرا وعدہ وعدہ ہے۔ دوبارہ اطمینان کے ساتھ ماں سے کہتا ہوں ماں مطمئن ہو جایئے میں لاپتہ نہیں ہوں گا۔ آپ کا تیسرا بیٹا اگر شہادت کے افتخار کو حاصل نہیں کر سکا تو آپ کی خدمت میں واپس

آجائیگا یا شہید ہوجائے گا اور پھر تم اس کی لاش کو دیکھوگی۔ مادر گرامی آپ مطمئن ہو جایئے میں جارہا ہوں اور واپس آتا ہوں۔

''یعنی دوبارہ میں اپنے فرزند عزیز کو آغوش میں لوں گی؟''

''تم مجھے دیکھوگی''۔

''میں اپنے نوجوان بیٹے کے چہرے کو بوسہ دوں گی؟''

''ضرور مجھے دیکھوگی''۔

''میں نہیں سمجھ پارہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو''۔

''میں لاپتہ نہیں ہوں گا''۔

کیا اچھا ہوا۔ خدا کا شکر ہے۔ میں تو مطمئن تھا کہ وہ جو میرا خریدار ہے اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ ماں سے کیا گیا وعدہ پورا نہ ہو۔

☆

ماں سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت لئے ہوئے پانچ مہینے گزر چکے ہیں اور اس عرصے میں صرف ایک بار ماں سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی تھی اور ان کی شفقت بھری آواز کی چاشنی سے محظوظ ہوا۔ ماں نے ٹیلی فون پر خدا حافظی سے پہلے مجھ سے کہا ناصر جان اپنا خیال رکھنا مجھے زیادہ انتظار نہ کرانا اور میں نے ٹیلی فون پر اس کا بوسہ لیا اور کہا یقیناً ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔

خدا کا شکر کیا اچھا ہوا کہ میرا وجود بکھرنے سے بچ گیا، نا تو میں تالاب میں غرق ہوا اور نا ہی دشمن کی زمین پر شہید ہوا۔ اگر اس طرح کا واقعہ پیش آتا تو میں بھی گم شدگان کی فہرست میں ہوتا اور ماں سے مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اور میرے تمام ساتھی اہواز میں شہید ہوئے ہیں، اب ضرور ماں کو خبر ہوجائے گی اور وہ مجھے 'معراج شہدا' اہواز سے حاصل کرنے کے لئے اس شہر میں

آئیں گی ۔لیکن کہاں تہران اور کہاں اہواز ۔ایک بوڑھی ماں بنا اپنے شوہر اور بیٹوں کی مدد کے اور وہ بھی اتنے غم اٹھانے کے بعد کہ جس کا دل رنج و غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہو وہ کس طرح اپنے آپ کو تہران سے اہواز تک پہونچائے گی۔اور میرے پیکر کو اہواز سے تہران تک لانے کے لئے گاڑی وغیرہ کا بندوبست کرے گی۔میں تو یہ سوچ کر مجبور ہوں اور بے خیالی کی دنیا میں جی رہا ہوں ۔ہاں خدا بزرگ ہے۔لیکن ایک نئی پریشانی میرے وجود کو فکر میں ڈال دیتی ہے۔

جس وقت کارکنان میرے بے روح جسم کو کھنڈروں سے باہر لانا چاہتے تھے میرا شناختی کارڈ وہیں رہ گیا یہاں تک کہ اس کی زنجیر بھی ٹوٹ کر گر گئی کوئی اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔لیکن اپنی بات کہنا میرے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔میری زبان دنیاوی دوستوں کے لئے بند ہو چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ برسوں قبل میں ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکا ہوں ۔جیسے ہی میں نے اس دنیا میں قدم رکھا سب سے پہلے میرے شہید بھائی محمد حسین اور حمید میرے استقبال کے لئے بڑھے۔میرا دل ان دونوں سے ملنے کے لئے کتنا بے قرار تھا۔میں نے کہا کاش میں اپنی ماں کو یہ خبر پہونچا سکتا کہ وہ اپنے دونوں گم شدہ بیٹوں کا انتظار نہ کرے۔وہ شہید ہیں اور اب ہم تینوں بھائیوں نے مل کر شہیدوں کی ایک انجمن تیار کر لی ہے۔دوبارہ ایک فکر میرے دل کو پریشان کئے ہوئے تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا شناختی کارڈ گم ہونے کی وجہ سے میری لاش کی پہچان نہ ہو سکے اور میرا نام بھی گم شدگان کی فہرست میں آجائے۔

معراج شہدائے اہواز کے فعال رضاکاروں نے شہدا کی لاشوں کو پہچاننے کا کام بڑی تیزی سے شروع کر دیا ہے اور علاقہ کے اعداد و شمار کے مطابق ہر علاقہ یا شہر سے جتنے لوگ آئے تھے ان کے کارڈ دیکھ دیکھ کر لاشوں کو پہچانا جا رہا ہے۔اب آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے اور میرے جسم کو ان تین لوگوں کے درمیان رکھ دیا گیا جن کی

شناخت ٹھیک طرح سے نہیں ہو پا رہی تھی۔اب ان تین لاشوں کا مسئلہ رہ گیا تھا۔فہرست مکمل ہونے میں ایک دوسری مشکل جو میرے ساتھ پیش آئی وہ یہ تھی کہ وہاں کے گرد و غبار اور پتھروں کے ریزے گرنے سے چہرے پر بدلاؤ سا آگیا تھا جس کی وجہ سے لاش پہچاننا آسان نہ تھا۔

میری شہادت کی خبر تہران پہنچی۔جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی ماں نے چادر اوڑھی اور ڈرتے ڈرتے قاصد سے میرے بارے میں پوچھا۔شروع میں ماں کو شدید زخمی ہونے کی خبر دی گئی، پھر بعد میں آہستہ آہستہ ان کے ذہن و دماغ کو آمادہ کرتے ہوئے شہادت کی خبر اس طرح سنائی کہ شاید ناصر شہید ہوگیا۔ماں یہ خبر سنتے ہی سفر کے لئے آمادہ ہوکر اسی قاصد کے ساتھ اہواز کے لئے روانہ ہوجاتی ہیں۔خدا کا شکر کہ چند گھنٹوں کے بعد میں اپنی آنکھوں کو ماں کی آنکھوں میں ڈالوں گا یعنی ماں کا دیدار کروں گا اور میرا وعدہ بھی پورا ہوجائے گا کہ میں گم نہیں ہوا میرا دل ان کے لئے کتنا پریشان ہے۔سی ۱۳۰ جہاز سے ان کو اہواز لانا مشکل ہے۔ان کے اندر طاقت نہیں کہ وہ ہوائی جہاز میں سوار ہوں اور خاص طور سے اس جنگی جہاز میں کہ جس کی آواز کو برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے۔

میں دور سے دیکھ رہا ہوں۔حقیقتاً اب دور و نزدیک کا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔میں دیکھ رہا ہوں کہ ماں ایک رضا کار لڑکی، ایک مجاہد لڑکے اور ایک ڈرائیور کے ساتھ فوج کی گاڑی میں سوار ہوئیں اور تہران سے اہواز کی طرف روانہ ہوگئیں۔

☆

لاش گھر کے بڑے، بھاری اور زنگ آلود دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔میری نگاہ اس طرف اٹھی۔کچھ لوگ داخل ہوئے۔ان لوگوں کے ساتھ اپنے ایک ساتھی کی ماں کو دیکھا۔دوسری دنیا میں داخل ہونے کے بعد سب نا آشنا میرے لئے آشنا ہو چکے

تھے۔وہ اپنے محسن کو تلاش کرتی ہوئی پریشانی اور بے چینی کے عالم میں لاش گھر میں داخل ہوئی۔محسن مجھ سے پہلے خداوند عالم کا مہمان بن چکا تھا،لیکن اس کا لاشہ دشمن کے علاقے میں رہ گیا تھا۔میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے اس کی لاش کو میدان جنگ سے ہٹانے کی کوشش کی تھی،لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔اب اس کی ماں کیا کرے گی۔کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اور محسن کی ملتے جلتے چہرے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے شناخت نہ ہوپائے یعنی اس کے بجائے میری لاش کو اپنے ساتھ لے جائے۔شہدا کے تابوت ایک ایک کر کے باہر نکالے جانے لگے اور محسن کے نہ ہونے کی صورت میں اس کی ماں پھر اپنی جگہ واپس آ گئی۔اب تقریبا میرے تابوت کا نمبر آ گیا اور وہ ضعیف رضا کار جو اس کام پر مامور تھا اس نے میرے تابوت کو باہر نکالا اور محسن کی ماں کو پہچاننے کے لئے بلایا۔محسن کی ماں نے چیخ ماری اور کہا:

''آہ میرے محسن جان۔تجھ پر قربان ہوجاؤں۔تم خود تو چلے گئے اور جاتے جاتے اپنے ساتھ ماں کے دل کو بھی لے گئے''۔

میں حیران ہوگیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ محسن کی جگہ مجھے لے جائیں۔میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ میری ماں ابھی راستے میں ہے۔شاید وہ اب خرم آباد سے آگے آچکی ہوگی اور احتمال یہ ہے کہ رات تک اہواز پہونچ جائے گی۔لیکن کوئی میری بات سنتا نہیں۔میں فریاد کرتا ہوں کہ میں محسن نہیں ہوں۔محسن کی ماں کے نالہ وفغان کے علاوہ کوئی آواز لاش گھر میں سننے کو نہیں مل رہی ہے۔ان کے اندر اتنی طاقت نہیں کہ دوبارہ میرا دیدار کریں۔محسن کی ماں کے اشارے پر میرا تابوت باہر نکالا گیا اور ایک تھوڑے موٹے سے کپڑے میں محسن سمجھ کر میری لاش کو لپیٹا اور ایک بکس میں جو تختے کا بنا ہوا تھا رکھا۔اور اس کے اوپر لکھا:

''پاسدار شہید محسن کیانی''

میں ان سے کہہ رہا ہوں: محسن کیانی کہاں؟ ناصر شریعتی کہاں؟ فریاد کر رہا ہوں۔ تبران کہاں اور اردبیل کہاں؟ میں کہہ رہا ہوں خدا تم پر رحم کرے میری ماں راستے میں ہیں۔ رات تک اہواز پہونچ جائیں گی۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ گم نہیں ہوں گا۔ مجھے ماں سے شرمندہ ہونے سے بچالیجئے۔

ناصر دل ہی دل میں کہتا ہے ایسا لگتا ہے کہ جتنے لوگ میرے آس پاس ہیں سب بہرے ہوگئے ہیں اور کچھ سن نہیں پا رہے ہیں۔ میرے تابوت کو پولیس کی گاڑی میں پیچھے رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس گاڑی میں اور کچھ سفید رنگ کی کار میں سوار ہوکر جنوب ایران یعنی اہواز سے شمال ایران یعنی اردبیل کی طرف لے جا رہے ہیں لیکن میری بات کوئی سن نہیں پا رہا ہے۔ میں پورے وجود کے ساتھ آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ میری ماں ایک طویل راستہ طے کرنے کے بعد معراج شہدا ئے اہواز میں مجھے تلاش کرنے کے لئے دوڑے گی اور خالی ہاتھ چلی جائے گی اور مجھے وعدہ خلافی کا متہم قرار دیگی۔

وہ لوگ ابھی اہواز سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سڑک کی دوسری جانب سے پولیس کی ایک گاڑی نظر آئی جو اہواز کی طرف آرہی تھی، جیسے ہی وہ گاڑی نزدیک آئی اس نے میرے بدن میں ایک لرزہ سا پیدا کردیا۔ ماں کی خوشبو سے میرا پورا بدن معطر ہوگیا تھوڑی دیر بعد کیا دیکھا کہ ماں لاش گھر میں داخل ہوئیں اور شہدا کے تابوتوں کے درمیان مجھے تلاش کرنا شروع کیا۔ تمام لاشے دیکھنے کے بعد جواب منفی رہا۔ دوبارہ سے ماں نے اس بزرگ رضا کار کو میری نشانیاں بتائیں وہ رضا کار حیرت میں پڑ گیا اور کہا:

> ”یہ نشانیاں جو تم بتا رہی ہو ابھی ایک گھنٹے پہلے شناخت ہوئی اور اس کی ماں اس کو لیکر اردبیل چلی گئی“۔

ماں نے کہا:

''جتنی جلدی ہو سکے مجھے اس گاڑی تک پہنچائیں''۔

ان سے پوچھا

''کون سی گاڑی؟''

''وہی گاڑی جو اس شہید کو لے کر اہواز کی طرف جا رہی ہے''۔

''کیسے معلوم اس میں تمہارا ناصر ہے''۔

''اس طرح کے ناصر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا''۔

''کیا؟''

''لاپتہ نہیں ہوگا''۔

قافلہ تیزی سے روانہ ہوااور مجھ تک پہونچنے کے لئے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔دوبارہ سے ماں کے دیدار کی آگ میرے دل میں شعلے کی طرح بھڑکنے لگی۔ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو جلدی نہیں تھی،لیکن میری ماں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ جلدی چلو۔ہمیں چلے ہوئے تقریبا دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔اب ماں کی خوشبو میری قوت شامہ تک پہنچ رہی ہے اور میرے نزدیک سے نزدیکتر ہوتی جاتی ہے۔یہاں تک کہ وصل کا وقت قریب آ گیا گاڑی کا ڈرائیور لائٹ جلاتا اور بجھاتا ہے،ہارن بجاتا ہے اور اس گاڑی کے ڈرائیور سے کہ جس میں میں ہوں کہنا چاہتا ہے کہ رکئے۔میری ماں پہلے میرے پاس نہیں آئی بلکہ محسن کی ماں سے ہم کلام ہوئی محسن کی ماں کہتی ہے:

''پروردگار کا شکر ہے کہ میرا بیٹا مل گیا''۔

ماں نے پوچھا آپ کا بیٹا کہاں ہے؟''

''اس گاڑی میں ہے۔اس کو ہم اردبیل لے جا رہے ہیں تا کہ اس کو اپنے گاؤں رضایت آباد میں دفن کریں''۔

پوچھا:

''کیا آپ رضایت آباد کی رہنے والی ہیں؟''

''ہاں اس کے والد وہاں انتظار کررہے ہیں۔میں اور وہ اپنے بیٹے کے لاپتہ ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے''۔

ماں نے پوچھا:

''کیا لاپتہ کی ماں ہونا مشکل ہے''۔

محسن کی ماں نے جواب دیا:

''خدا کسی کو یہ دن نہ دکھائے ،بہت مشکل کام ہے میری بہن برسوں سے اپنے لاپتہ بیٹے کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہے''۔

میری ماں نے پوچھا:

''کیا تم؟''

''میں بھی نزدیک تھی کہ اپنی بہن کے غم میں مبتلا ہوجاؤں،لیکن میرے اندر برداشت کا اتنا حوصلہ نہیں ہے۔اگر مجھ سے کہا جاتا کہ تیرا بیٹا لاپتہ ہوگیا تو میں اپنی جان اس جان آفرین خدا کے سپرد کردیتی جس نے یہ جان عطا کی ہے۔خدا جانتا ہے کہ میں اس چیز کا حوصلہ نہیں رکھتی اور میرے بیٹے کو مجھ تک پہنچا دیا گیا''۔

میری ماں محسن کی ماں کے ساتھ تابوت کے درکو کھولتی ہیں اور وہ کپڑا جو میری صورت پر پڑا تھا ہٹاتی ہیں،وہ شعلے جو میرے اندر اور میری ماں کے اندر بلند ہورہے ہیں ایک ہی آگ سے تعلق رکھتے ہیں۔تمام وجود کو حرارت اور گرمی ماں ہی کی محبت پہنچاتی ہے اور ماں بھی ایک کپڑے میں لگی آگ کے مانند ہے،دل چاہتا ہے کہ صبر کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ کر فریاد کرے:ناصر جان خوش آمدید اور وہ اپنے ہونٹوں کو میری

زخمی پیشانی پر رکھ کر دل کی گہرائیوں سے کہنا چاہتی ہیں اے میرے پیارے بیٹے تو اپنے پورے وجود جوش وحرارت اور اپنی تمام قوت کے ساتھ ظاہرا اطمینان حاصل کر لے۔

وہ محسن کی ماں کے سامنے مجھ کو نہیں پہچانتی تا کہ محسن کی ماں کا دل نہ ٹوٹ جائے۔صرف اور صرف ایک جملہ محسن کی ماں سے کہتی ہے تم کو یہ تمہارا نورانی شہید مبارک ہو۔لیکن اس ایک جملہ کے ساتھ مجھ کو بہت سی چیزوں سے آگاہ کر دیا۔اس وقت ماں کا میرے ساتھ رہنا، مجھ سے بات کرنا اور راہنمائی حاصل کرنا، وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھ سے پوچھنا کہ کیا کروں ؟ کیا یہ ٹھیک ہے کہ میں اس ماں کے دل کو توڑ دوں بہت بہت شکریہ کہ تم نے اپنے وعدہ کو پورا کیا اور تم گم نہیں ہوئے، لیکن تم ہی بتاؤ بیٹا میں کیا کروں۔تھوڑی دیر بعد اس کا وجود پر سکون ہو جاتا ہے۔

☆

اب یہ دسواں سال ہے کہ میری ماں آب و ہوا بدلنے کے بہانے سال میں ایک بار اردبیل کا سفر کرتی ہیں اور ہفتے کے درمیانی دن جب شہدا کے مزاروں پر زایرین نہیں ہوتے رضایت آباد علیا کے اس سرسبز و شاداب قبرستان میں میرے مزار کے سامنے بیٹھتی ہیں کہ جس پر محسن کیانی کا نام کندہ ہے اور مجھ سے دل کا راز بیان کرتی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ محشر کے میدان میں اس ماں کی بھی شفاعت مجھے نصیب ہوگی۔

زچہ خانہ

میں تو خود کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ کبھی ہوش میں آجاتا تھا اور کبھی بیہوش ہوجاتا۔ کبھی تو میری حالت ٹھیک ہوجاتی تھی اور تمام باتیں اچھی طرح سمجھنے لگتا اور کبھی عجیب وغریب حالت ہوجاتی اور کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بیہوش ہوں یا نیند میں۔ ایک مرتبہ جیسے ہی میں ہوش میں آیا دیکھا کہ چار لوگوں نے مجھے پکڑ رکھا ہے اور ایمبولینس کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ایمبولینس کے چلنے سے پتہ چلا کہ مجھ کو علاج کے لئے اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ وہ ٹھٹھرتی ہوئی سردی اور دل دہلا دینے والی ٹھنڈی ہوا ایمبولینس کے پیچھے والے دروازے کے سوراخوں سے اندر آنے کی وجہ سے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کو لرزا رہی تھی۔ میری حالت تھوڑی بہتر ہوئی۔ میں ایمبولینس کی ڈراؤنی اور خطرناک آواز کو اچھی طرح سن رہا تھا۔ اچانک بائیں طرف جو پلٹا تو دیکھا کہ ایک دوسرا زخمی بھی اس ایمبولینس میں میرا ہمسفر ہے۔ میں ایمبولینس کے بریک کے جھٹکوں اور بار بار رکنے کو محسوس کر رہا تھا۔ تیسری بار جب ایمبولینس رکی اور میرے زخمی ہمسفر کو اتارا گیا تو اندازہ ہوا کہ پہلے بھی ایمبولینس دو اسپتالوں میں رک چکی ہے۔ لیکن ان دونوں اسپتالوں میں ہم دونوں کو داخل کرنے کے لئے بیڈ خالی نہیں تھا۔ شہروں پر شدید بمباری کی وجہ سے تمام اسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تیسرے اسپتال نے ایک زخمی کو لے لیا۔ اب میں اکیلا اس ایمبولینس میں تھا۔

مدد کرنیوالی ٹیم مجھے داخل کرانے کے لئے خالی جگہ کے چکر میں گھوم رہی تھی۔ مجھے پتہ نہیں ساتویں یا آٹھویں جگہ رکنے کے بعد ایمبولینس کا دروازہ کھلا۔ ہمارے ساتھ جو افراد تھے ان کا اصرار تھا کہ مجھے یہیں اتاریں۔ لیکن اسپتال کا نمایندہ اس بات پر راضی نہیں تھا کہ مجھے اس اسپتال میں داخل کرے۔ کافی دیر تک بحث و مباحثہ کے بعد اسپتال کے نمائندے نے کہا: یہ کوئی عام اسپتال نہیں ہے، یہ زچہ خانہ ہے۔ مدد کرنے والی ٹیم کے وہ افراد جو ایرپورٹ سے میری مدد کے لئے ساتھ آئے تھے انہوں نے کہا: یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں پوری طرح بھرا تو نہیں ہے لیکن ان کو زچہ خانہ میں کیسے داخل کیا جاسکتا ہے۔

میں دل ہی دل میں خدا خدا کر رہا تھا کہ اسپتال کے نمایندے کی بات مان لی جائے اور زچہ خانہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ دوسری ایمبولینسوں کی خطرناک آوازیں کہ جو ایرپورٹ سے زخمیوں کو لا رہی تھیں کی طرف اشارہ کر کے اسپتال کے نمایندے سے کہا کہ زخمیوں کی تعداد جو جنگ سے لائے جارہے ہیں بہت زیادہ ہے۔

ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ مجھے ایک خادم ایمبولینس سے نکال کر زچہ خانہ لے گیا۔ اندر جاتے وقت میری نظر بورڈ پر پڑی تو معلوم ہوا کہ میں شہر ہمدان میں ہوں۔ اپنے رزن شہر کے نزدیک۔ فلائٹ نمبر سی ۱۳۰ نے مجھے اہواز سے سیدھے ہمدان منتقل کردیا ہے۔ اسپتال کی سیڑھیوں سے گزرتے ہوئے کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ راستے میں الٹے پڑے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھ کو وارڈ نمبر ۲ میں منتقل کردیا گیا۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر آخری کمرہ تھا۔ ایک گھنٹے بعد میرے سرہانے ایک لمبا سا گتے سے بنا ہوا بورڈ لگایا جس پر لکھا تھا: رامین فخری ۳۲ سال، جنگ میں زخمی۔

سب سے پہلے میرے زخمی پیر سے اہواز میں کی گئی مرہم پٹی کو کھولا گیا اس کے بعد ڈیٹال اور بیٹا ڈین سے دھو کر دوبارہ پٹی کردی گئی۔

میرے کمرے میں تین بیڈ تھے جس میں دو خالی تھے۔ نوزاد بچوں کے رونے کی آوازیں مسلسل دوسرے کمروں سے آرہی تھی۔ داخل ہونے کے بعد سے کچھ نرسیں جن کو میرے اس روم میں داخل ہونے کی اسپتال کی طرف سے اطلاع نہیں دی گئی تھی کمرے میں اچانک آجاتیں اور مجھے دیکھ کر حیران رہ جاتیں، کچھ نرسیں اپنی آنکھیں ملنے لگتیں اور مجھ پر حیرت کرتیں کہ کہیں غلطی سے تو نہیں آگئے، کچھ اپنی پیشانی پر شکن ڈالتیں اور آنکھوں کو ادھر ادھر پھراتیں اور یہ دیکھنا چاہتیں کہ جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ کچھ تو جیسے ہی کمرے میں قدم رکھتیں زچہ خانہ کے بیڈ پر ایک مرد کو دیکھ کر چیخ مار کر فوراً ہی پیچھے ہٹ جاتیں۔

اسپتال کی انتظامیہ نے ایک نرس کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ کوئی کمرے میں داخل نہ ہو، تا کہ کوئی پریشانی محسوس نہ کرے۔ لیکن وہ کہاں ایک جگہ جم کر بیٹھ سکتی تھی تا کہ لوگوں کو کمرے میں داخل ہونے سے روکے۔ جیسے ہی وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی جگہ سے ہٹتی تو فوراً ملاقات کرنے والوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی اور ان میں سے بہت سے تو دروازے سے ہی پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

دوپہر چار بجے کے بعد ایسا لگا کہ ایک نرس ایک نوزاد کو لیکر میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے سونے کی غرض سے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ زچہ خانہ کے انچارج نے فخری نامی ماں کے نوزاد بچے کو نرس کو دیا کہ دودھ پلانے کے لئے اس کی ماں کے پاس لے جائے، اس نے وہاں کے رجسٹر میں میرا نام دیکھا اور کمرے کا نمبر دیکھ کر میرے پاس لائی تا کہ دودھ پلاؤں۔ اسکو باہر بیٹھی نرس نے اشارہ سے روک کر واپس کر دیا۔ ساڑھے پانچ بجے سہ پہر ایک دوسرے نوزاد کو لایا گیا کہ جس کی کلائی پر لکھا تھا نوزاد پسر، ماں کا نام خانم رامین۔ پھر بھی اسپتال کے رجسٹر سے رامین فخری یعنی میرے ہی کمرے کا نمبر ان کو دے دیا تھا۔

اتفاق تو دیکھئے۔ اس دن تیسرے نوزاد کو میرے کمرے میں لانے پر ایک عجیب بات ہوئی۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا فیملی نام فخری تھا اور باپ کا نام رامین۔ میں دو مہینے سے جنگ پر گیا ہوا تھا اور میری حاملہ بیوی گھر پر تھی۔ جب سے میں گیا تھا گھر سے کوئی خیر و عافیت نہیں ملی تھی۔

ایک دن پہلے اس کو اپنے شہر یعنی رزن سے ہمدان منتقل کر کے اسی اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے اس اسپتال میں داخل ہونے سے قبل والی رات کو خداوند عالم نے مجھ کو ایک بیٹا عطا کیا تھا جس کی مجھ کو بھی خبر نہیں تھی۔ اس بار یہ میرا ہی بیٹا تھا کہ جس کو میرے پاس لایا گیا تا کہ اسے دودھ پلا دوں۔ قاصد کے ذریعے بیوی کو خبر دی کہ میں بھی اسی اسپتال میں ہوں۔ دو دن بعد میں اور میری شریک حیات اپنے ننھے بیٹے صادق کے ساتھ اسپتال سے چھٹی پا کر رخصت ہو گئے۔

دولھا کی پھوپھی

دولہا کی ماں کو متوجہ کرنا مشکل تھا۔ان کے صرف ایک بیٹا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کے پروگرام میں ان کی تمام آرزو اور تمنائیں پوری ہوں ۔اگر چہ مہمانی میں دلہن کے ماں باپ، دو بھائی اور بہن کے علاوہ کچھ نزدیکی رشتہ داروں کو بھی دعوت میں بلایا گیا تھا۔لیکن کل ملا کر بات چیت کے لئے جو یہ میٹنگ رکھی گئی تھی کوئی بہت بڑی نہ تھی۔دولھا کی جانب سے بھی اس کے ماں، باپ، دو بہن اور ایک بھائی تھے یعنی کل ملا کر پانچ لوگ دعوت میں بلائے گئے ۔یہ بات فطری ہے کہ دولھا کی پھوپھی جن کو کدخدا کہتے ہیں وہ بھی اس جلسے میں شریک ہوں۔اگر دولھا او ردلھن کو بھی شامل کیا جائے تب بھی اس مہمانی میں شرکت کرنے والے لوگ زیادہ نہیں تھے۔

پہلے دولھا، دلہن دونوں آپس میں بات چیت کر چکے تھے اور پھر دولھا اور ان کے خاندان کے لوگ بھی رسمی طور پر رشتہ لیکر دلھن کے گھر گئے تھے۔اور دلھن کے گھر والوں نے بھی رشتہ کو منظور کرلیا تھا۔اب بعد کے کاموں کا نمبر آیا۔ دونوں گھر والوں نے آپس میں بیٹھ کر شادی کے پروگرام کو بھی آخری شکل دے دی تھی۔میرج ہال کی بات ہوگئی تھی اور اس کی سجاوٹ، لائٹ وغیرہ جیسے تمام کام پورے ہوگئے ۔میرج ہال کے بعد شادی کی تاریخ تک تمام کام مثلاً کپڑوں کی خریداری، لباس کا سلنا، ضروری لوازمات کی خریداری، عقد کا دسترخوان، بیوٹی پارلر کا انتخاب، دعوت ناموں کی تقسیم اور

دوسری چیزیں۔الغرض کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس تاریخ تک فراہم نہ ہو سکے۔

اگر چہ دلہن کی ماں کی خواہش تھی کہ شادی پورے دھوم دھام سے ہو، لیکن دلھن کے باپ کا ماننا تھا کہ یہ ایک الٰہی فریضہ ہے جو بیٹی کے لئے انجام دیا جارہا ہے اور اپنے دین کے مطابق جو ذمہ داریاں بچوں کے لئے ہیں انہیں ادا کرنا ہی چاہئے۔اسی وجہ سے زیادہ سختی نہیں کی اور وہ تمام شرطیں جو اس جلسے میں رکھی گئی تھیں مان لی گئیں۔تالیوں کی آواز دلہن کے مہمانوں والے کمرے میں گونجی اور تمام لوگوں کے ساتھ دلہن کے باپ نے بھی تالیاں بجانے میں ساتھ دیا۔

دلہن کے باپ حاجی محسن کے موبائل فون پر ہونے والی رنگ نے تھوڑی دیر کے لئے جلسہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔جب وہ واپس آئے تو پہلے جیسی خوشی ان کے چہرے پر نہیں تھی۔اس کے بعد دلہن کی ماں نے جب دو تین نئی باتوں پر شوہر کی توجہ نہیں دیکھی تو حیران رہ گئیں۔وہ اپنے میاں کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔انہیں احساس ہوا کہ نہ صرف یہ کہ بات نہیں کررہے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ وہ ہم لوگوں کے درمیان ہی نہیں ہیں۔انہوں نے تعجب کے ساتھ شوہر سے پوچھا:

''حاجی محسن کہاں ہو؟''

ایسا لگ رہا ہے حاجی محسن بیوی کی آواز ہی نہیں سن رہے ہیں، کوئی جواب نہیں دیا۔

مریم نے دوبارہ کہا:

''میں تم سے مخاطب ہوں، کہاں ہو؟''

شوہر نے کہا:

''کوئی ایسی بات نہیں ہے''۔

مریم کا اصرار یہ جاننے کے لئے کہ کیا مسئلہ پیش آیا ہے بڑھتا جارہا ہے۔

پھر پوچھا:

''اگر کچھ ہوا ہے تو بتاؤ''۔

حاجی محسن نے کہا:

''مریم تم نے سنا کہ ٹیلی فون آیا تھا''۔

''ہاں کون تھا؟''

''تلاش کرنے والے گروہ کے افراد''۔

''کیا کوئی نئی خبر تھی؟''

''ہاں، آہستہ بات کرو''۔

''یقیناً بھائی حسن کی کوئی خبر تھی''۔

''ہاں مریم، بہت خوش کر دیا لیکن اس خوشی کا اس جلسے کی خوشی سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے''۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ یہ جلسہ ختم ہو جائے بعد میں بات کریں''۔

''نہیں مریم یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے یہ بات یہیں عرض کرنی ہے''۔

''کیا کہنا چاہتے ہو۔تم کو معلوم نہیں کہ سارا پروگرام درہم برہم ہو جائے گا''۔

حاجی محسن حاضرین کی نگاہوں کے سامنے ٹیلی فون کے سلسلے میں اپنی اور اپنی بیوی کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہے تھے، پھر انہوں نے کہا:

''دوستوں عزیزوں ایک لمحہ کے لئے توجہ کیجئے''۔

انہوں نے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے اس جلسے کے اصول کے خلاف مہمانوں سے کہا کہ محمد و آل محمد پر صلوات بھیجئے۔صلوات نے جلسے کی فضا کو ایک نیا رنگ دے دیا۔پھر انہوں نے کہا:

''ابھی ابھی مجھ کو موبائیل پر خبر دی گئی ہے کہ تلاش کرنے والے گروہ کے افراد نے بھائی حسن کا جنازہ جو بیس سال سے زیادہ سے لاپتہ تھا تلاش

کرلیا۔ہم اس کی شہادت کے وقت سے جو حاجی عمران کے علاقہ میں ''والفجر۲'' کے جنگی آپریشن کے دوران واقع ہوئی تھی بے خبر تھے۔ کئی مرتبہ مختلف طریقوں سے کوشش کی کہ اس کی شہادت یا اسیری سے آگاہ ہوجائیں، لیکن کبھی کامیابی نہیں ملی۔اب ظاہرا تلاش کرنے والے گروہ کے ذریعے اس کا جنازہ مل گیا ہے اوراچھی بات یہ ہے کہ اس کا شناختی کارڈ بھی بالکل ٹھیک تھا''۔

وہ لوگوں کو بتارہے تھے او رحاضرین حیرت میں تھے۔سب کے سب سکتے میں آگئے تھے جیسے سروں سے بجلی گزر گئی ہو۔ہنسی ان کے لبوں سے رخصت ہوچکی تھی۔اور ان لوگوں کا چہرہ بھی بتارہا تھا کہ وہ پریشان ہوگئے ہیں۔تمام لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ کونسا موقع ہے خبر دینے کا۔تمام لوگ شادی کے جشن کو ترتیب دینے کے لئے جمع ہوئے ہیں، اس پروگرام کا لاپتہ شہید سے کیا رابطہ ہے۔کہاں شادی کا ذکراور کہاں کفن دفن کی باتیں؟

لیکن حاجی محسن کی باتیں سنجیدہ تھیں اورشادی کے پروگرام کی فضا پر حاوی ہوگئیں اورتھوڑی دیر کے لئے جلسہ پرحیرت سی طاری ہوگئی۔سکوت و انتظار نے گویا پورے جلسے کی آواز کونظم وضبط سے باندھ رکھا تھا۔شور شرابہ، خوشی و شادمانی سب کے سب کافور ہوچکے تھے۔تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

دولھا کے باپ نے خاموشی کی دیواراوراس مایوس کن ماحول کوتوڑتے ہوئے کہا:

''ایک اورصلوات بھیجئے''۔

محمد وآل محمد پر دوبارہ صلوات نے جلسے کی فضا کواس طرح کردیا کہ جیسے کہ گلاب پاشی کردی گئی ہو۔

اور پھر کہا:

''جیسا کہ آپ تمام لوگ جانتے ہیں کہ حاجی محسن ہم سب سے زیادہ بزرگ ہیں اور آپ کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔ہم کو چاہئے کہ ان کے نظریے کو معلوم کریں اور ان سے پوچھیں کہ اب ہم کیا کریں؟''

شہین خانم دولھا کی پھوپھی نے کہا:

''انشاءاللہ حاجی صاحب اجازت دینگے کہ شادی کرلی جائے''۔

دولھا کے باپ نے اپنی بہن سے کہا:

''تم یہیں بات ختم کرو اور فی الحال اجازت دیں پھر دیکھتے ہیں ہم لوگوں کی باتوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے''۔

دولھا کی پھوپھی نے کہا:

''ہمارا بھی سن زیادہ ہے ہم نے بھی زمانے کی سردی اور گرمی کو محسوس کیا ہے۔اور ہمیں معلوم ہے کہ کیا کریں''۔

داماد کے بھائی نے کہا:

''جلدی نہ کیجئے۔اجازت دیجئے تا کہ حاجی محسن کے نظریے کو معلوم کیا جاسکے۔دلہن کے باپ کی رائے ہمارے لئے اہم ہے''۔

شہین خانم نے کہا:

''بھائی جان، ہم تمام شہدا کا احترام کرتے ہیں۔کیا ہمارے چچا کا بیٹا شہید نہیں ہوا، لیکن یہ دوسری بات ہے۔ یہ شہید کوئی تازہ شہید نہیں ہے۔حقیقت میں تقریبا بیس سال پہلے شہید ہوا اور وہیں دفن ہوگیا۔اب تو صرف ان کی ہڈیاں لائیں جارہی ہیں''۔

دلہن کے باپ نے کہا:

''آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شادی اپنے وقت مقررہ پر ہونی چاہئے''۔

پھوپھی نے پوچھا:

''یعنی آپ مخالف ہیں؟''

دلہن کے باپ نے کہا:

''میں آپ تمام لوگوں کا جو یہاں اس جلسے میں حاضر ہیں احترام کرتا ہوں اور آپ لوگ اپنے اپنے نظریات سے واقف کرایئے''۔

دولھا کی ماں نے کہا:

''اگر مناسب سمجھیں تو شادی کی تاریخ ہٹادیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے''۔

دولھا کی ماں کی اس بات سے شہین خانم کو بہت زیادہ غصہ آیا اور بلند آواز میں کہا:

''خانم کیا کہتی ہو؟ میرج ہال تلاش کرتے کرتے ہماری حالت خراب ہوگئی تب جا کر کہیں اس تاریخ کے لئے میرج ہال بک ہوا ہے۔کارڈ بھی چھپ چکے ہیں۔تمام چیزیں اسی تاریخ کے لئے تیار کی جاچکی ہیں کس کس چیز کو بدلیں گے۔مگر ایسا کیسے ہوسکتا ہے''۔

آہستہ آہستہ شہین خانم غصے میں آگئیں اور بلند آواز سے بات کرنے لگیں اور چہرے پر غصے کے آثار ظاہر کر کے کہا:

''ان کی کیا۔ان تمام چیزوں کو مہیا کرنے میں ہم نے بڑی زحمت اٹھائی ہے۔کیا تم اس شہید کے لئے کفن و دفن کا انتظام کرنا چاہتے ہو؟ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ جو ہڈیاں ہیں ان کو خاموشی کے ساتھ دفن کردیا جائے۔اور کیا فرق پڑتا ہے کہ ان چار ہڈیوں کو ابھی دفن کیجئے یا پھر ایک مہینے بعد۔یہ تو بیس سال سے دفن ہی تھیں''۔

یہ بات کہنے والی دولھے کے خاندان کی کدخدا تھیں اوران کے بات کرنے سے پوری محفل میں سناٹا سا چھا گیا تھا لیکن کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

پھر سے دولھا کے باپ کے بولنے کا نمبر آیا۔وہ حاجی محسن کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔بحث جاری تھی۔ زیادہ تر لوگوں کی رائے شادی کی تاریخ بدلنے کی تھی۔آخر کار یہ طے پایا کہ شادی آگے بڑھادی جائے۔اس بات پر اس وقت کی نشست برخاست ہوئی۔حاضرین مایوسی کے عالم میں وہاں سے اٹھے اور وہ خوشی اور تالیوں کی صدائیں جو نشست کے شروع ہوتے وقت تھیں مایوسی میں بدل گئیں۔ صرف ایک پھوپھی تھیں جو خاموش نہیں ہوئیں، وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھیں اور اب بھی بار بار تکرار کررہیں تھیں کہ کیا ہو جائیگا اگر ان چار ہڈیوں کو ایک دو ماہ بعد دفن کر دیا جائے۔لیکن کوئی بھی ان کی بات سے اتفاق نہیں رکھتا تھا اور اہمیت نہیں دے رہا تھا۔نشست بغیر نتیجہ کے یعنی شادی کی تاریخ بدلنے کی بات پر آیندہ خبر تک کے لئے ملتوی کردی گئی۔

یہ محفل ختم ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب چلے گئے اور دلھن کے گھر میں ان کے خاندان کے لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں رہا۔وہ رات تلخ وشیرین رات تھی۔عجیب رات۔غم وسوگ سے ملی جلی رات تھی۔لیکن جو بھی تھی آخر کار تمام ہوگئی۔

''اے خدا توبہ، اے خدا توبہ، اے خدا میں نے غلط کیا''۔

دولھا کے گھر میں حاضرین میں سے ایک عورت کی گریہ وزاری اور توبہ واستغفار کی آواز نے سوئے ہوئے کچھ لوگوں بیدار کردیا۔صبح کی ہلکی سی روشنی نکلنی شروع ہوئی تھی۔شہین خانم گریہ کررہی تھیں اور توبہ واستغفار کررہی تھیں۔ بھائی نے بہن کے سر کو آغوش میں لیا اوران کو خاموش کرانے کی کوشش کی:

''کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟''

لیکن وہ مسلسل روئے جارہی تھیں۔ بھائی نے پھر پوچھا:

''کیا ہوا؟ کیا کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟''

شہین خانم نے کہا ابھی میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک صحرا میں ہوں۔اور چہل قدمی کررہی ہوں۔میرا پیر تالاب میں پھسل گیا اور پیچھے واپس آنے کی جہد و جہد میں میری ایڑیاں تک حوض میں چلی گئی تھیں۔اس مرتبہ جتنی کوشش کی کہ خود اپنے آپ کو بچاسکوں اور زیادہ تالاب میں ڈوبتی چلی جاتی یہاں تک کہ کمر تک دھنس گئی۔ میں نے سوچا کہ اب میرا کام تمام ہونے والا ہے جب میں نے کوشش کی کہ تالاب سے باہر آؤں تو سینے تک غرق ہوچکی تھی۔میں نے بے ساختہ فریاد کی تا کہ کوئی مجھے بچالے۔ایک نہایت حسین وجمیل شخص نے ہاتھ بڑھایا اور کہا میرا ہاتھ پکڑو اور باہر آجاؤ۔ جب میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پہنچا تو راحت محسوس کی اس شخص نے آہستہ آہستہ مجھ کو تالاب سے باہر نکالا اور یقینی موت سے نجات دلائی۔

میں نے پوچھا:

''آپ کون ہیں؟''

جواب دیا:

''میں وہی چار رہڈیاں یعنی شہید حاجی حسن ہوں''۔

آئیڈیل

''میں نے کچھ زیادہ ہی زندگی کے دن گزار لئے ہیں''۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''مجھے ان لوگوں سے پہلے شہید ہونا چاہئے تھا''۔

''زندگی ہمارے اور تمہارے ہاتھ میں نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہے''۔

''لیکن شہادت کی صلاحیت خود ہمارے ہاتھ میں ہے''۔

''بہر حال شہادت بھی موت کی ایک قسم ہے اور یہ موت کی سب سے اہم قسم ہے۔ مگر زندگی کا خاتمہ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے''۔

مجھے اب زندہ رہنے میں شرم آتی ہے، اپنے پڑوسی اور عزیز و اقربا سے''۔

''خلاف کار لوگوں کو شرم آنی چاہئے''۔

''چار سال سے اس ملک میں جنگ جاری ہے ہماری گلی میں کوئی ایسا گھر نہیں ہے کہ جس کا کوئی نہ کوئی فرد شہید نہ ہوا ہو اور ہمارے رشتہ دار بھی کم شہید نہیں ہوئے ہیں''۔

''خوش قسمت ہیں وہ شہید اور ان کے گھر کے افراد۔ لیکن اس بات کا شرم سے کیا تعلق ہے''۔

''میں اس وجہ سے شرمندہ ہوں کہ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی شخص شہید ہوا ہے

اور اب تک ہمارے گھر کا ایک بھی شخص شہید نہیں ہوا''۔

''تمہارا شہید ہونے کا بہت دل چاہ رہا ہے، امید ہے کہ خدا تم کو جلد شہادت نصیب کرے گا''۔

''میں خود بھی خدا سے دعا مانگ رہا ہوں کہ مجھے شہادت بھی حاصل ہو اور انداز شہادت بھی نیا ہو''۔

''آج تک میں نے نہیں سنا تھا''۔

''کیا نہیں سنا تھا''۔

''شہادت کے انداز کی اصطلاح کو''۔

''لیکن میں نے خدا سے کچھ چاہا ہے''۔

''کیا چاہا ہے؟''

''مثالی شہادت۔''

''کون سی مثالی شہادت؟''

''تم کو نہیں بتا سکتا''۔

جنگ کو شروع ہوئے پانچواں سال ہے اور یہ سال ہمیں ایک بڑی امید کے ساتھ گزارنا ہے۔ میری کوشش رہے گی کہ کم چھٹی لوں۔

جب کبھی وہ چھٹی پر گھر جاتا ہے تو اپنے شہر کے اس اسکول میں کہ جس میں کئی سالوں تک معلمی کے فرائض انجام دے چکا تھا ضرور جاتا تھا اور اس حکیم نظامی اسکول کے ایک ایک کلاس میں جا کر بچوں کو جنگ کے بارے میں بتاتا اور ان کو جنگ پر جانے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس بار مصطفیٰ ایک ہفتہ کی چھٹی لیکر آیا ہے۔ ابھی چوتھا دن بھی چھٹی لئے ہوئے نہیں گزرا تھا کہ خبر آئی کہ کل صبح جماران میں حاضر ہو کیونکہ مختلف افواج کے افسران

امام خمینی کی خدمت میں پہنچنے والے ہیں۔مصطفیٰ بھی ایک افسر ہے۔اب مصطفیٰ صبح ہونے اور افسر اعلی کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے اور ان کی زیارت کے انتظار میں ہے۔

تمام لوگ قطار میں کھڑے ہوئے ہیں، کھڑے نہیں ہیں بلکہ آہستہ آہستہ حرکت کررہے ہیں۔صف سے نکل کر ایک ایک کرکے ہر افسر امام کی خدمت میں پہونچ رہا ہے اور امام سے ہاتھ ملا رہا ہے۔امام کے ہاتھوں کو چوم رہا ہے۔دو تین جملوں میں امام سے بات ہوتی ہے ہر ایک کی گفتگو صرف اور صرف سلام اور احوال پرسی تک محدود ہے۔بعض لوگ التماس دعا کہہ رہے ہیں اور ان میں سے کچھ کی زبان پر آپ پر قربان جاؤں ہے۔بعض کہہ رہے ہیں ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہیں حکم فرمایئے۔کسی نے امام سے کہا دعا کیجئے۔سبھی افسر دو تین چار سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سیکنڈ میں چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے امام سے ہاتھ ملاتے ہوئے یا چہرے کا بوسہ لیتے ہوئے وہاں سے گزر رہے ہیں۔امام کی دست بوسی کرنے اور ان سے ہمکلام ہونے میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے روح الٰہی سے ہمکلام ہیں۔دو تین لوگوں سے زیادہ نہیں رہ گئے تھے کہ مصطفیٰ کا نمبر آیا۔لائن اسی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ آخر کار مصطفیٰ کا نمبر آیا۔مصطفیٰ امام کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر چومتا ہے۔اپنی نظر امام کے چہرے پر جما کر آنکھوں سے اشک جاری کرتے ہوئے امام سے کچھ کہتا ہے امام جواب دیتے ہیں۔پھر دوسرا جملہ کہتا ہے امام جواب دیتے ہیں۔پھر مصطفیٰ کچھ اور کہتا ہے۔امام کے ہلتے ہوئے ہونٹ بتاتے ہیں کہ مصطفیٰ سے بات ہورہی ہے۔دور سے یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بات کا موضوع کیا ہے۔مصطفیٰ کے چہرے اور اس کے انداز سے ظاہر ہورہا ہے کہ وہ امام سے کچھ چاہتا ہے اور امام سے اصرار کررہا ہے۔ مصطفیٰ کے بعد جس کا نمبر ہے وہ آگاہ کرتا ہے کہ آگے چلئے ابھی دوسرے لوگ بھی

لائن میں ہیں وقت کم ہے۔لیکن مصطفیٰ ہاتھ نہیں چھوڑتا، دس سیکنڈ، پندرہ سیکنڈ یہ دوطرفہ گفتگو ہورہی ہے۔بیس سیکنڈ، پچیس سیکنڈ۔ہم لوگ مصطفیٰ کو آگاہ کرتے ہیں کہ اپنے وقت کے حساب سے بات کرو۔ابھی دوسرے لوگ بھی منتظر ہیں۔یہاں تک کہ تقریبا تیس سیکنڈ ہوگئے کہ اس نے امام کے ہاتھ کو نہیں چھوڑا ہے۔آنسو بہہ کر زمین تک آرہے ہیں۔وہ امام سے اصرار کررہا ہے۔میں نے دور سے دیکھا کہ دوبارہ امام کا ہاتھ چوما اور جب پانچ چھ لوگوں کا وقت لے لیا تو امام کے ہاتھوں کو چھوڑا اور آگے بڑھ گیا۔اب جو میں نے اس کو دیکھا کہ ایک عجیب طرح کا سکون و آرام اس کے چہرے سے نمایاں ہے، ایسا سکون پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔رات سے صبح تک جتنی بار اس کو دیکھا وہ پریشان اور بے قرار نظر آیا لیکن اب سکون سے ہے۔میں نے اس کو پریشان کرنے کے لئے پوچھا:

''مصطفیٰ تم نے لوگوں کو کتنا پریشان کیا؟''

جواب دیا:

''کیا کروں۔میرے ہاتھ میں نہیں تھا''۔

میں نے کہا:

''تمھیں دوسروں کا خیال رکھنا چاہئے تھا''۔

جواب دیا:

''شاید آپ لوگوں میں سے کوئی بھی میری طرح مشکل سے دوچار نہیں تھا''۔

''کیسی مشکل؟''

''میں امام سے ایک چیز چاہتا تھا''۔

''کیا چاہتے تھے؟''

''نہیں بتا سکتا''۔

''کیا اب ہم نامحرم ہو گئے''۔

''ابھی نہیں بتا سکتا''۔

''ٹھیک ہے بعد میں بتانا''۔

''انشاءاللہ موقع آنے پر بتاؤں گا''۔

امام سے ملاقات ہوئے چند ماہ گزر گئے۔ بدر کے فوجی آپریشن کا وقت آ گیا۔ لشکر میں مصطفیٰ کا جوش و خروش پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ان چند ماہ میں، میں نے مصطفیٰ سے دو تین بار پوچھا کہ تم اس دن امام سے کیا چاہ رہے تھے لیکن ابھی تک جواب نہیں ملا۔

آج بدر کے جنگی آپریشن کا نمبر ہے۔مصطفیٰ اس بات کو بھول گیا کہ یہاں سرحد ہے۔بہت نڈر ہو گیا ہے۔تمام کی تمام فوج جو مصطفیٰ کی افسری میں کام کر رہی تھی اس بات کی گواہ ہے کہ اتنی بے باکی اور جوش و خروش و ولولہ اپنے افسر میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ جنگ کے عالم میں مجھے ایک طرف کھینچا اور کہا آج وقت آ گیا ہے۔

میں نے پوچھا:

''کس چیز کا؟''

جواب دیا:

''تا کہ تمھیں بتاؤں کہ اس دن امام سے میں کیا چاہ رہا تھا۔اب وہ خود مجھ کو بتانا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا کیا چاہتے تھے۔جواب دیا میں نے خدا سے درخواست کی کہ جس طرح کی میں شہادت چاہتا ہوں جو میں نے انتخاب کی ہے وہی عطا کر''۔

میں نے کہا:

''شہادت کے انتخاب سے کیا مطلب؟شہادت، شہادت ہے مگر کوئی بوٹیک ہے؟ کہ لباس کے چکر میں رہو''۔

جواب دیا:

''میں زیادہ زندہ رہنے کی بنا پر اپنے گلی کوچہ کے شہیدوں کے خاندان سے شرمندگی محسوس کررہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری شہادت تھوڑی الگ اور مشکل کے ساتھ ہو، تا کہ میرے زیادہ زندگی گزارنے کا کفارہ ادا ہوسکے''۔

میں نے پوچھا:

''کس طرح کی؟''

جواب دیا خدا کی راہ میں ذبح ہوجاؤں۔تم نے دیکھا ہوگا کہ جب گوسفند کو ذبح کیا جاتا ہے تو اس کی آدھی جان تڑپتی رہتی ہے اور گلے سے خون جاری رہتا ہے۔میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ گوسفند کی طرح قربان ہوں۔

میں نے کہا:

''کیوں پریشان کررہے ہو''۔

اس نے جواب دیا:

''اس دن میں نے امام سے کئی بار کہا کہ دعا کیجئے کہ میں شہید ہوجاؤں۔ امام نے جواب دیا کامیاب ہوگے۔میں نے کہا امام دعا فرمایئے کہ جس طرح میں چاہتا ہوں اسی طرح شہید ہوں۔امام نے جواب دیا انشاء اللہ کامیاب ہوگے۔میری طرف سے اصرار اور امام کی جانب سے انکار لیکن میں نے اس چیز کو اتنی بار تکرار کیا کہ ایک سیکنڈ بعد میں سمجھ گیا کہ امام کا دل راضی ہوگیا اور انہوں نے اپنی نظروں سے سمجھادیا قبول''۔

اس نے کہا:

''دعا کرو میری قسمت میں بھی ہو''۔

میں نے کہا:

''مبارک ہو، تم کون ہو؟''

جس وقت میں اس کے سرہانے پہنچا، کیا دیکھا پہلو کے بل پڑا ہے اور گلے سے خون جاری ہے خرخر کی آواز اس کے گلے سے نکل رہی ہے ہاتھ پیر مار رہا ہے، پھڑ پھڑا رہا ہے اور پر و بال والے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔ گویا کہ آسمان میں اڑنے کے لئے تیار ہے۔ایک بڑا تیر آیا اور اس کے گلے سے پار ہوکر نکل گیا۔اور ایک بڑا شکاف ہوا مصطفیٰ خاموش ہوا تا کہ وہ مائل پرواز ہو سکے۔

خاک

جس زمانے میں اس کا شوہر فرانس کی فوج میں افسر کے عہدے پر فائز تھا تو وہ بھی اس کے ساتھ الجزایر میں خوش وخرم تھی۔ ملازمت کے سلسلے میں ہونے والے چھوٹے بڑے سفروں میں فلورا اکثر اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کا شوہر اپنی فوجی ذمہ داریوں یا پھر اپنے دفتری کاموں میں مصروف رہتا اور فلورا الجزایر کے شمال میں دریائے مڈیٹرانہ کی نہایت ہی بہترین اور دلکش آب و ہوا میں، تفریح اور خرید وفروخت میں مصروف رہتی یا ان تفریح گاہوں میں جو فرانس کی فوج کی طرف سے اس دلکش اور خوبصورت جگہ پر بنائی گئی تھیں سیر سپاٹا کرتی۔ کچھ دیر وہاں تفریح کرتی اور کبھی تھک کر آرام کرتی اور پھر ناچنا شروع کر دیتی اور بعد میں الجزایر کے معروف تحائف وغیرہ کے ساتھ پیرس لوٹ آتی۔

یہ چیز ان کے لئے روایت سی بن گئی تھی کیوں کہ کئی پشتوں سے ان کے اجداد اور دوسرے لوگ فرانس کی فوج میں کام کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ لوگ الجزایر کے عربوں کو تہذیب وتمدن سے روشناس کرانے کے لئے ان کے ذرایع کا استعمال کرتے تھے اور اس پر اپنا پورا اختیار سمجھتے تھے اور وہ لوگ اس سے بھی باخبر تھے کہ فرانس میں ایجاد ہونے والی نئی دوائیوں کے تجربات بھی الجزایریوں پر ہی کئے جاتے تھے۔ اہل افریقہ کو کم تر جان کر تجربات پر قربان کیا جاتا کیوں کہ با تمدن افراد جیسے فرانسیسی اور یوروپین کا تجرباتی دوائیوں پر قربان کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ وہ کہتی تھی جہاں تک

مجھے یاد ہے یا میں نے سنا ہے ہمارے تمام آباء واجداد کی خدمت میں الجزایری نوکر تھے۔ اس کا الجزایر کا آخری سفر اپنے شوہر کرنل سارکوزی کے ساتھ موسم خزاں سنہ ۱۹۵۳ میں ہوا تھا اس کا اعتقاد تھا کہ ۱۹۵۴ کے بعد الجزایری دہشت گرد بن کر غیر تہذیبی و تمدنی کام انجام دے رہے ہیں لہذا اب ان نمک حراموں کی سرزمین پر سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔اس کے نظریے کے مطابق ملت اور بالخصوص فرانس کی فوج کا بڑا حق الجزایر کی گردن پر ہے۔کیوں کہ ۱۸۳۰ سے تقریبا ۱۳۰ سال تک انہیں کی نسل کے کچھ لوگ ملک الجزایر کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور اپنی تمام کوششیں اس ملک کے لوگوں کو نئی دنیا میں داخل کرنے کے لئے انجام دے چکے تھے۔اور ان کا واقعا حق بنتا ہے کہ وہ اپنی زحمات کے نتیجے میں ان کے ملک کی چیزوں سے فائدہ حاصل کریں اور ان سے اپنی خدمت کروائیں۔

کرنل سارکوزی ۱۹۵۴ سے ۱۹۶۲ تک ساڑھے سات سال کی جنگ کے عرصے میں الجزایریوں کو سبق سکھانے کے لئے کئی بار وہاں گیا۔اور اس کے لئے باعث افتخار امر یہ ہے کہ ہزاروں الجزایری دہشت گرد اس کی زیر نگرانی فوج کے ذریعے نیست و نابود ہو گئے۔اس عرصے میں الجزایریوں کے مارے جانے کی تعداد دوسرے لوگوں نے ایک لاکھ بتائی ہے۔لیکن خود الجزایری ڈیڑھ ملین بتاتے ہیں۔فلورا نے اس جنگ کے دوران اپنے شوہر سارکوزی کے ساتھ الجزایر جانے کی ہمت نہیں کی۔اس کے ذہن میں صرف اور صرف ۱۹۳۱ سے ۱۹۵۳ تک کے سفر کی یادیں محفوظ تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوران جنگ الجزایر کا سفر کرے۔

☆

اب ۱۹۸۰ ہے۔اٹھارہ سال کا وقت ملت الجزایر کا فرانسیسیوں کے خلاف آزادی کی جنگ کو ہو رہا ہے۔فلورا نے ستائیس سال سے الجزایر کو نہیں دیکھا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کم از کم ایک بار اس کا شوہر اس کو مڈیٹرانہ دریا کے جنوبی ساحل پر لے چلے اور وہ الجزایر میں جا کر دیکھے کہ فرانسیسیوں کے نکلنے کے اٹھارہ سال بعد وہاں کیا واقعات رونما ہوئے۔ کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کا اعتقاد ہے کہ اگر لوگ فرانسیسیوں کے خلاف شورش نہیں کرتے اور عرب کے بحری لٹیرے فرانسیسیوں کی فوجی کشتی کو الجزایر میں وارد ہونے سے نہ روکتے تو اب تک الجزایر اور وہاں کے لوگ انسان بن گئے ہوتے اور اقتصادیات اور صنعت کے میدان میں بھی آگے بڑھ گئے ہوتے۔

☆

کرنل سارکوزی کے ریٹائرڈ ہونے کی خبر اس کی شریک حیات فلورا کے الجزایر کے سفر کے لئے کہ جو آیندہ ہفتے ہونے والا تھا بہترین خبر تھی۔اس خبر نے فلورا کو خوش کردیا اور اس کی آرزو بر آئی۔ اسکا ماننا تھا کہ اسکا شوہر اور دوسرے فرانسیسی فوج کے لوگوں کا الجزایر پر ایک بڑا حق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فرانس والے الجزایر کی مٹی اور پانی سب پر اختیار رکھتے ہیں اور اب یہ زبردستی وہاں سے نکالے گئے ہیں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

جمعہ کے دن دسمبر ۱۹۸۰ کو اس نے اپنے شوہر کے ساتھ ایک گھنٹے کی مختصر پرواز کے ذریعے پیرس سے الجزایر تک کا راستہ طے کیا اور بہت جلد ہی الجزایر کی راجدھانی کے ایرپورٹ پر اترے۔فلورا کی سوچ کے برعکس وہاں کی فضا اور جغرافیے میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہی آب و ہوا اور وہی اسلامی آرٹ جو ابھی تک کچھ عمارتوں پر باقی تھی اور وہی مڈیٹرانے کے ساحل پر بنے چار ستارہ ہوٹل میں قیام۔

اس نے وہاں اپنے قیام کے تیسرے دن ارادہ کیا کہ زینب کو جس سے وہ برسوں سے مانوس تھی تلاش کرے اور پچھلی یادوں کو تازہ کرے۔ زینب برسوں تک

کرنل سارکوزی کے گھر خدمت انجام دیتی رہی جسے فلورا اپنی کنیز سمجھتی تھی۔لیکن اس کے علم اورادب و احترام نے فلورا کو اس کا احترام کرنے پر مجبور کردیا تھااور وہ اب کئی برسوں سے اس کی جستجو میں ہے کہ اس کو تلاش کرے اور اس کی معلومات سے فائدہ اٹھائے۔خاص طور سے وہ عربی سمجھتی تھی۔ہوٹل کے ٹی وی نے الجزایر کے بارے میں دکھانا شروع کیا۔ ٹی وی دیکھتے ہی وہ گذشتہ یادوں میں کھوگئی۔اس دن الجزایر کی تاریخ کی ایک قیامت خیز خونیں ترین دن کی سالگرہ تھی کہ جس دن الجزایری فرانسیسیوں کے ماتحت رہ کر قربان ہوئے تھے۔ان سالوں میں فرانس حکومت نے الجزایر کے عوام سے کہا تھا دوسری جنگ عظیم میں وہ لوگ فرانس کی فوج کے ساتھ آجائیں اور اگر فرانس کی فوج جنگ میں کامیاب ہوگئی تو وہ ان کی سرزمین چھوڑ دیگی۔ یہ ایک بڑا انعام تھا جو الجزایر کے عوام کو وعدہ کی شکل میں دیا گیا تھا۔اس وجہ سے وہ لوگ فرانس کی فوج میں شامل ہوگئے اور انہیں امید تھی کہ اس جنگ میں کامیابی کے بعد الجزایر فرانسیسیوں کے قبضے سے آزاد ہوجائے گا۔

کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا۔فلورا پروگرام دیکھ رہی تھی۔الجزایری دانشمند اور مفکرین اس دن کے واقعات پر تبصرے کررہے تھے۔ جیسے ہی اس کی نگاہ زینب پر پڑی خوشی کی وجہ سے اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی اور کہا میں تجھے تلاش کررہی تھی اور چاہتی تھی کہ تجھے تلاش کرنے نکلوں تو تو میرے ٹی وی کے شیشے پر آگئی۔اب ٹی وی پر زینب کے بات کرنے کا وقت تھا فلورا نے سنا کہ زینب کہہ رہی ہے: جس وقت فرانس کامیاب ہوا تو یہاں کے لوگوں نے خوشی اور دلیرانہ طریقے سے فرانس کی زمین کو چھوڑ دیا اور الجزایر واپس آگئے اور اس وعدے کے مطابق جو پہلے کیا گیا تھا فرانس کی حکومت سے درخواست کی کہ اب ہمارے ملک سے چلے جائیں۔وہاں کے سیاسی شخصیات اور افواج کے افسران نے اس درخواست کو بخشی نہ جانے والی ایسی گستاخی

سمجھا جس کا جواب گولیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔انہوں نے اپنی پوری طاقت سے، ان ٹینکوں، توپوں، میزائیلوں اور بندوقوں سے جو دریائے مڈیٹرانہ میں موجود جہازوں پر نصب تھیں نہتے الجزایری عوام پر حملہ کردیا تا کہ فرانسیسی فوج کی مدد کرنے کا انعام دیا جائے۔ لوگوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا۔ پہاڑوں کے اوپر سے نیچے پھینک دیا گیا، ٹینک اور بھاری گاڑیاں لوگوں کے ہجوم پر چلائی گئیں اور ان کو کچل دیا گیا۔ ان دنوں اس دل دہلا دینے والے قتل عام سے قبل الجزایر کے مختلف شہروں میں فرانسیسیوں سے آزاد ہونے کی خوشی میں لوگ صفوں کی صفیں بنا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے، مست تھے۔لیکن فرانسیسیوں نے تیروں کی بارش اور گولیوں سے ان لوگوں کو قتل و غارت کردیا۔

فلورا زینب کی اس گفتگو کو سننے کے بعد پریشان ہوئی اور اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ زینب کی بات سنے لیکن دوسری جانب اب زینب ایک پڑھی لکھی اور سمجھدار عورت تھی کہ جس کی صداقت پر برسوں تک فلورا کا ایمان رہا ہے لیکن اسکا دل زینب کی طرف تھا نہ کہ اس کی باتوں پر۔مگر اس کے اندر زینب کی باتوں کو سننے کا حوصلہ نہیں رہا اس نے ارادہ کیا کہ ٹی وی بند کردیا جائے وہ آرام کے ساتھ ٹی وی تک پہونچی، زینب کی زبانی سنا کہ فرانسیسیوں نے ہماری ملت کے جشن کو اور ان کی دوسری جنگ عظیم میں کامیابی کو خاک و خون میں ملا دیا اور ان لوگوں کی آزادی کی خوشیوں کو الجزایر کی ۱۳۰ سالہ تاریخ میں عظیم حادثہ میں تبدیل کردیا۔اور ایک دن میں پینتالیس ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔فلورا کے اندر زینب کی باقی باتیں سننے کی طاقت نہیں تھی جس کا بدلہ ٹی وی بند کر کے لیا گیا۔

فلورا کے نزدیک یہ بات کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ فرانس نے ۱۳۰ سال تک الجزایر کو اپنے زیر تسلط رکھا۔ وہ فرانسیسیوں کے الجزایر میں تسلط کو فرانس کی

الجزایریوں کے حق میں ایک بڑی مدد او رخدمت سمجھتی تھی تا کہ الجزایر کے لوگ تمدن سے آگاہ ہو جائیں۔

فلورا اور کرنل سارکوزی نے الجزایر میں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران اس ملک سے متعلق ان حقیقتوں کو سنا جو فرانس کی میڈیا سے سننے کو نہیں ملی تھیں۔کرنل سارکوزی ان میں سے بہت سے حقائق سے باخبر تھا لیکن اس نے اس طرح کی کوئی بات اپنی بیوی کو نہیں بتائی۔

الجزایر میں ان لوگوں کا ایک ہفتہ کا قیام بجلی کی طرح تیزی سے گزر گیا۔اب ان لوگوں نے الجزایر کو خدا حافظ کہہ کر فرانس کی طرف سفر شروع کیا۔کسٹم پر تعینات ملازم ان سے سامان وغیرہ کے بارے میں سوال کرتا ہے، کسی طرح کی کوئی مشکل پیش نہیں آئی، لیکن ایک سامان جو، ان کو تحفہ میں ملا تھا اس کے سلسلے میں ایک کسٹم والے نے فرانس لے جانے پر ایک شرط رکھ دی۔

کرنل کسٹم ملازم سے پوچھتا ہے:

''کیا شرط ہے؟''

اس نے کہا:

''اس تحفے میں سے کچھ حصے کو لے جاسکتے ہو او رکچھ کو نہیں''۔

''مگر یہ کیا ہے کہ جس کے کچھ حصے کو لے جانے کی اجازت ہے اور کچھ کی نہیں''۔

''آپ نے یہ گلدان کہاں سے خریدا ہے؟''

''واضح ہے کہ الجزایر سے''۔

''یہ گلدان اور اس میں رکھا ہوا پھول اصلی ہیں یا نقلی''۔

''ٹھیک ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ اصلی ہے''۔

''آپ کوصرف پھول لے جانے کی اجازت ہے''۔

''ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں''۔

''آپ اس سونے کے بنے قیمتی گلدان کو بھی لے جاسکتے ہیں''۔

''تو پھر نہ لے جانے والی چیز کون سی ہے۔ یہ تو سب کے سب لے جاسکتے ہیں۔

کسٹم کا ملازم پھول کو گلدان سے باہر نکالتا ہے اور پھول فلورا کو دیتا ہے۔پھر اس کی خاک کو نکال کر خالی گلدان کرنل سارکوزی کے سپرد کرتا ہے

کرنل نے پوچھا:

''میں اس کا مطلب سمجھا نہیں''۔

کسٹم ملازم نے کہا:

''ہم نے اپنے وطن کی خاک کی نجات کے لئے تم غاصبوں کے ہاتھ تقریبا ڈیڑھ ملین لوگوں کو شہید کروایا۔سیکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور لاکھوں لوگ تمہاری جیل میں اذیتوں کا شکار ہوئے یا آرا مشینوں سے ان کے سر قلم کردے گئے۔یہ تمام چیزیں اپنے وطن الجزایر کی خاک کی حفاظت کیلئے تم فرانسیسیوں کے ہاتھ انجام پائی اس لئے کہ یہ خاک ہماری ہے نہ کہ تمہاری۔اب آپ خوشی کے ساتھ تشریف لے جایئے''۔

کچھ اور انتظار

جب میں کوچک خانم کوسلام کرتا ہوں تو وہ بالکل نہیں ڈرتیں۔ بہت اطمینان سے مسکرا کر شاد و بشاش چہرے کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیتی ہیں۔ان سے کہتا ہوں:

''میں ملک الموت ہوں اور روح قبض کرنے کے لئے آیا ہوں''۔

کوچک خانم کہتی ہیں:

''میں مرنے کے لئے تیار ہوں''۔

میں نے کہا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

کوچک خانم کہتی ہیں:

''صبر کرو مجھے معلوم ہے کہ خداوند عالم کی طرف سے آئے ہو اور یہ بھی جانتی ہوں کہ موت کے فرشتے ہو لیکن مجھے مرنے کے لئے وقت درکار ہے''۔

میں کہتا ہوں:

''ماں شاید تم نے پہچانا نہیں میں ملک الموت ہوں۔اب تک نہ معلوم کتنے لوگوں کی فائل بند کر کے ان کی روح قبض کر چکا ہوں''۔

کوچک خانم نے جواب دیا:

''مجھے معلوم ہے، لیکن مجھے وقت چاہئے''۔

میں نے پوچھا:

''کب تک؟''

جواب دیا:

''جب تک اپنے بیٹے کو نہ دیکھ لوں''۔

میں نے پوچھا:

''تم کون سے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہو؟''

جواب دیا:

''سہراب کو''۔

میں نے پوچھا:

''کہاں ہے؟''

جواب دیا:

''میدان جنگ میں آقائے خمینی کی مدد کرنے کے لئے''۔

لیکن میں اس کام کے لئے متعین کیا گیا ہوں اور مجبور ہوں۔ کوئی حل نکلنے والا نہیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا سہراب واپس کب آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی بات پر توجہ ہی نہ کروں۔ یہ پہلی بار نہیں ہے کہ کسی کی روح قبض کرنے گیا ہوں اور وہ نالہ وفریاد کرتے ہوئے یہ نہ کہے کہ ابھی وقت درکار ہے۔

دوبارہ بسم اللہ کرکے کوچک خانم کی روح قبض کرلوں اور پھر دوسری جگہ چلا جاؤں۔ جیسے ہی کوچک خانم کے نزدیک گیا تو ان کے چہرے پر نور الٰہی دکھائی دیا اور یہ وہ نور ہے جو میں نے بارہا اولیاء خدا کے چہروں پر دیکھا ہے۔

حکم ہوا:

''رک جاؤ''۔

میں حیران ہوا باوجود اس حیرانی کہ میری نظر اس بوڑھی عورت کے ملایم و نورانی چہرے سے جس سے نور کی شعائیں نکل رہیں تھیں ہٹ نہیں رہی تھی۔ میں تھوڑا پیچھا ہٹا اور وہاں سے چلا گیا''۔

دوبارہ حکم ملا کہ لوندویل گاؤں جا کر اس ساٹھ سالہ کوچک خانم کی روح قبض کروں۔خداوندا یہ کیا حکمت ہے! ابھی تین دن پہلے مجھے اس بوڑھی عورت کی روح قبض کرنے کے لئے بھیجا تھا، اب پھر حکم دیا جارہا ہے کہ کوچک خانم کی زندگی کی فائل بند کردی جائے۔ اسی فکر میں ہوں کہ اپنے آپ کو اس گاؤں کے آسمان پر دیکھتا ہوں۔کتنی جلدی پہنچ گیا! اتفاق سے گذشتہ جمعرات کو بھی اسی گاؤں سے پندرہ کیلومیٹر دور مامور تھا، آستارا میں۔ایک عورت ایک مرد اور ایک بچے کی روح قبض کی تھی۔ان لوگوں کا گاڑی سے ایکسیڈینٹ ہوگیا تھا۔ لوگوں کو کیا معلوم ؟ میں نے خود چند منٹوں کے فاصلے پر تینوں کو دوسری دنیا میں پہونچادیا تھا۔

لیکن آج صبح آستارا میں کیا خبر تھی! کسی کو کل کے ایکسیڈینٹ میں مرنے والوں کی کچھ فکر نہ تھی۔ایک بہت بڑی تعداد دو شہیدوں کے جنازہ میں شریک تھی۔ میں ان دونوں کو پہچانتا ہوں۔چار دن پہلے کردستان میں شہید ہونے والے شہید نقیب زادہ کو بھی اور شہید برنجی کو بھی۔ اگرچہ میں نے ہی ان دونوں کی لطیف روح کو قبض کیا تھا لیکن دوسرے شہید کے لئے میرا دل بہت پریشان ہوا۔ دشمنوں نے اس کی کھال تک کھینچ لی تھی۔پچھلے چند مہینوں میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں بلکہ اس طرح کے کئی معاملے سامنے آچکے ہیں کہ کھال کھینچ لی گئی۔گذشتہ چند سالوں میں اس علاقہ میں اس طرح کے بہت سے واقعات سامنے آئے ہیں۔ سہراب برنجی کی تو زندہ رہتے ہوئے

کھال کھینچ لی گئی تھی۔اور اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ محبّ اہل بیت تھا اور جہاد کے لئے گیا تھا۔اگر محبت اہل بیت گناہ ہے تو میرے ساتھ سارے فرشتے اور خدا بھی اس گناہ سے مبرّا نہیں ہیں اور ہم سب معترف ہیں۔نائب امام زمانہ کے ملک کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سے امام رضا کے اس ملک میں منافقوں نے ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے پیکروں کو خاصی تعداد میں کردستان اور دوسرے شہروں میں جلا دیا، ٹکڑے ٹکڑے کردیا یا اور دوسری طرح کے شکنجہ میں کھینچنے والی تکلیف کے بعد میرے حوالے کیا۔آج صبح نقیب زادہ کی تدفین آستارا میں ہوئی لیکن ظہر کے بعد سہراب کولوندویل گاؤں لایا گیا تا کہ اسی گاؤں میں اسکی تدفین عمل میں آئے۔

بدھ کے دن عصر کے وقت امام جمعہ آستارا نے آصف کو بھیجا تا کہ وہ یہ پتا لگائے کہ ان دو شہیدوں نے کہاں مجھ سے ملاقات کی ہے۔انہوں نے آصف سے کہا: دیکھو اگر موت کے فرشتے نے میدان جنگ میں روح قبض کی ہے تو چاہئے کہ اسی جنگی لباس میں ان کو دفن کریں۔آصف ان دو بے جان لاشوں کو دیکھنے کے بعد آقای سید علی اکبر کے گھر واپس آیا اور کہا: دونوں کے دونوں کردستان کی ڈیموکریسی پارٹی کے مسلح افراد کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں۔پتا چلتا ہے کہ سہراب کو بہت زیادہ اذیت کے ساتھ شہید کیا گیا۔اس کے بدن کے گوشت سے یہ چیز ظاہر ہے۔

تمام لوگ لوندویل گاؤں کے میدان میں جمع ہیں اور روز عاشورا کی طرح نوحہ خوانی اور سینہ زنی کررہے ہیں۔تقریبا ایک سال سے ایرانیوں کا دفاع ملک کے دشمنوں کے خلاف شروع ہوا ہے۔آج پہلا شہید ہے کہ جس نے اپنی شہادت کی خوشبو سے اس گاؤں کی فضا کو مہکادیا ہے۔آصف لوگوں کو خاموش ہونے کو کہتا ہے۔سید علی اکبر صاحب کی گردن میں رومال لپٹا ہوا ہے وہ مسجد کی چھت پر جاتے ہیں تا کہ مجمع کو مخاطب کریں۔سب کے سب خاموش ہوجاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

"اے لوگوں ! شہیدوں کا پیام یہ ہے کہ ہمارے ہتھیار زمین پر نہیں
رہنے چاہئے، اے لوگوں ..."

گذشتہ ایک سال میں اس طرح کے منظر بہت دیکھے گئے ہیں۔لیکن مجھے اپنی ڈیوٹی میں دیر نہیں کرنی چاہئے ۔ میں آیا ہوں کہ کوچک خانم کی روح قبض کروں ۔اوپر سے لوگوں کے ہجوم پر نظر ڈال رہا ہوں لیکن وہ دکھائی نہیں دے رہی ہیں، تمام لوگ موجود تھے ۔آئندہ والے گراہک بھی موجود ہیں ایک ایک کر کے سب کے پاس جانا ہے ۔سب کے سب سید علی صاحب کی گفتگو سننے میں مصروف ہیں ۔ مجھے چاہئے کہ اس بوڑھی عورت کو تلاش کروں۔

دور سے چار لوگوں کے ایک گروپ کے گریہ و زاری کی آواز جس میں مرد و عورت دونوں ایک ساتھ چل رہے ہیں سننے کو ملتی ہے ۔وہ جلدی جلدی اپنے قدموں کو آگے بڑھاتے ہوئے اور کچھ تلاش کرتے ہوئے خود کو اس جم غفیر تک پہونچاتے ہیں۔ان چار لوگوں کا گریہ و زاری و آہ و فغان کے ساتھ آنا بہت سے لوگوں کی توجہ کو اس تقریر سے ہٹا دیتا ہے۔ان لوگوں کی کوشش ہے کہ کسی طرح سے ایمبولینس تک پہنچ جائیں اور سہراب کے جنازے کو دیکھ لیں۔تلاش کرلیا۔اپنا شکار پالیا۔کوچک خانم بھی ان لوگوں کے درمیان ہے۔ جناب فرض اللہ ان کی بیوی اور حاجی حبیب کی بیٹی بھی اس چھوٹے گروپ کا حصہ ہیں۔آنے والے وقت میں جلدی یا دیر ان سب کی روح بھی قبض کرنا ہے۔

جلسہ میں ان لوگوں کی دخل اندازی کی بنا پر سید علی اکبر کافی پریشان نظر آئے ۔وہ سخت پریشان اور مضطرب دکھائی دے رہے ہیں ۔وہ اشارے سے آصف سے کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو اس مجمع میں آنے کی اجازت نہ دینا۔آصف نے دو لوگوں کو امام جمعہ کے فرمان بجالانے کے لئے مامور کیا۔تقریر دوبارہ شروع ہوئی ۔میں اس فکر

میں ہوں کہ خود کو کس طرح کوچک خانم تک پہونچاؤں۔

وہ اپنے قدموں کو تیز تیز رکھتا ہے۔ یہ چار لوگوں کا گروپ اس بھیڑ میں پہونچ جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کے لئے راستہ صاف کردیا کہ یہ آگے چلے جائیں اور کچھ افراد جو نہیں ہٹے انہیں ایک طرف کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ایمبولینس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابراہیم ان دو لوگوں میں سے ہے جن کو آصف نے ان لوگوں کو روکنے کے لئے مامور کیا تھا۔ وہ کہتا ہے:

''ماں صبر کرو۔ تقریر ختم ہونے دو''۔

کوچک خانم کہتی ہیں:

''وقت نہیں ہے۔ جناب آگے چلئے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تین روز پہلے عزرائیل روح قبض کرنے کے لئے آیا تھا میں نے اس سے وقت لیا ہے کہ میں پہلے بیٹے کو دیکھ لوں بعد میں روح قبض کرلینا''۔

ابراہیم بھیڑ کے درمیان سے آصف کی طرف اشارہ کرتا ہے جو مسجد کی چھت پر امام جمعہ کے پاس کھڑا ہوا ہے اور کہا:

''میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں ان کو روک سکوں''۔

آصف دور سے ابراہیم کو اشارہ کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ چھوڑو اس کی ماں کو ایمبولینس کے پاس جانے دو اور اس کا دروازہ بند کردو۔ وہ چاہتا ہے کہ کوچک خانم کے گریہ و زاری کی آواز جلسہ میں مزاحمت کی باعث نہ بنے۔

ایمبولینس کا دروازہ کھلتا ہے اور کوچک خانم اس میں داخل ہوجاتی ہیں، فرض اللہ صاحب بھی مدد کرتے ہیں کہ سہراب کی ماں سوار ہوجائے اور خود بھی سوار ہوجاتے ہیں۔ لیکن میرے لئے یہ چیز کوئی حیثیت نہیں رکھتی کہ ایمبولینس کے دروازہ کھلنے کا انتظار کروں، میں تو بند دروازوں کو بھی عبور کرلیتا ہوں، دیواروں سے بھی گزر جاتا ہوں۔

قلعہ و برج و دیوار میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ البتہ ایمبولینس میں داخل ہونے کے لئے جلدی نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کہاں جانا ہے اور مجھے تو کوچک خانم کی پاکیزہ روح کو خدا کا مہمان بنانے کے لئے مامور کیا گیا ہے۔

دو تین دن سے اس شہید کی ماں کو نظر میں رکھے ہوئے ہوں۔ مجھے ان سے مل کر کافی اچھا لگا۔ آج ہی صبح ملک ناز، سہراب کی بڑی بیٹی جس کی عمر بارہ سال ہے۔ اپنے باپ کی شہادت پر گریہ کر رہی تھی۔ کوچک خانم نے اپنی پوتی سے پوچھا:

''بیٹی کیا ہوا جو تم رو رہی ہو؟''

ملک ناز نے کہا:

''میرے باپ شہید ہو گئے''۔

دادی نے کہا میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں۔ الحمد للہ مجھے پورا یقین ہے کہ ضرور اس کے جنازے کو دیکھوں گی، میں تب ہی مروں گی کیونکہ میں نے عزرائیل سے اجازت لے لی ہے کہ جب تک سہراب کو نہیں دیکھوں گی مروں گی نہیں۔

وہ ٹھیک کہتی ہے، تین دن پہلے خود اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی اس کی روح قبض نہیں کر سکتا۔ اے خدا ایسا نہ ہو کہ بیٹے کی آرزو پوری ہو گئی ہو اور مجھے خبر نہ ہو۔

تقریباً دو ماہ قبل کی بات ہے۔ موسم سرما کا پہلا دن تھا۔ سہراب نے اپنے چھوٹے سے پرانے بیگ کو تیار کر لیا تھا اور نقیب زادہ اس کو تلاش کرتا ہوا آیا کہ ایک ساتھ مجاہدوں کے گروپ میں شامل ہونے کے لئے آستارا چلیں۔ کوچک خانم پریشان ہوئیں اور خاموش ہو گئیں گویا ان کی زبان بند ہو گئی ہو۔ وہ سہراب سے پوچھنا چاہتی تھیں کہ اگر وہ شہید ہو گیا تو وہ اس کے پانچ بچوں کو جو اس کے پوتے پوتیاں ہیں ان کے ساتھ کیا کریگی کس طرح ان کی پرورش کرے گی۔ سہراب کا سب سے چھوٹا بچہ بیس دن سے زیادہ کا نہیں ہے۔ اپنے ہونٹوں کو دبایا اور کہا بیٹا التفات دیکھو

میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ساٹھ سال میری زندگی کے گزر چکے ہیں۔مجھ میں طاقت نہیں ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کرسکوں، دلہن بھی اکیلی ہے، چھوڑو میدان جنگ جانے کی ضد چھوڑو۔

سہراب کو جیسے ہی کوچک خانم نے التفات کہہ کر اس کو آواز دی پوچھا:

''ماں آپ مجھ سے راضی ہیں؟''

کوچک خانم نے کہا:

''التفات میں کیا کہہ رہی ہوں تم کیا کہہ رہے ہو''۔

التفات نے کہا:

''مادر گرامی مگر آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ انہیں سردیوں کے شروع میں منصور حاجی کاظم کا بیٹا مریض ہوا اور ایک ہفتہ کے اندر مر گیا''۔

ٹھیک کہہ رہا ہے۔خود میں نے ہی منصور کی روح قبض کی تھی اس دن بھی اس گاؤں کا یہی حال تھا۔

کوچک خانم نے کہا:

''التفات جان! منصور کے مرنے سے تمہارا کیا تعلق ہے''۔

التفات نے کہا:

''ماں! موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔میں جس جگہ بھی جاؤں گا یہاں تک کہ شہید بھی ہو جاؤں گا تو پھر بھی واپس آؤں گا اور تمہارے ساتھ جنت میں داخل ہوں گا۔تم بچوں کی فکر مت کرو۔ان کا بھی خدا مالک ہے''۔

کوچک خانم نے کہا:

''حقیقتاً تم سے بات نہیں کرسکتی۔امام خمینی نے سب کو اپنا عاشق بنالیا ہے اور دین خدا کا عاشق''۔

التفات نے نے پوچھا:

''ماں جنت میں میرے لئے تازہ چائے بناؤ گی؟''

میں اس سے پہلے سمجھ چکی تھی کہ بیٹے کی تمنا ہے کہ وہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہو۔اور اب اگر چہ آخر بہمن ہے اور اب بہار کی خوشبو آنا چاہئے لیکن ایران کا شمالی علاقہ اس وقت سردیوں کی چپیٹ میں ہے۔لوگ لوندویل گاؤں میں واقع مسجد فاطمہ الزہراء کے سامنے اکٹھا ہیں اور سردی سے کانپ رہے ہیں۔کوچک خانم نے جناب فرض اللہ کی مدد سے ایمبولینس کی سیڑھیوں کو طے کیا اور اپنے آپ کو اس کے اندر پہنچایا۔سہراب کی شریک حیات سوار نہیں ہوسکیں۔ابراہیم نے کوچک خانم اور فرض اللہ کے سوار ہونے کے بعد ایمبولینس کے پیچھے والے دروازے کو بند کردیا تھا سہراب کی شریک حیات کی حالت ایسی ہوگئی جیسے کسی نے اس کے سر پر سرد پانی ڈال دیا ہو۔وہ یہ جانتی تھی کہ یہ ساس سے اس کا آخری دیدار ہے۔آج ہی کی بات ہے کہ جب اس نے شوہر کا فوٹو الماری سے نکالا تا کہ تابوت پر لگانے کے کام آئے تو کوچک خانم نے اس سے پوچھا:

''کیا میرا التفات شہید ہوگیا؟''

سہراب کی شریک حیات کہتی ہیں:

''جس وقت میں نے سہراب اور ان کے التفات کی شہادت کی خبر ان کو دی تو انہوں نے کہا: الحمدللہ میں بھی اس کے ساتھ جارہی ہوں کیونکہ میں نے عزرائیل سے وقت لیا تھا کہ جب تک میں اپنے بیٹے کو نہیں دیکھوں گی مروں گی نہیں''۔

تھوڑا وقت بھی نہیں گزرا تھا کہ فرض اللہ صاحب نے ایمبولینس کے پیچھے کا دروازہ بند کیا وہ کہتا ہے جیسے ہی یہ بزرگ ماں سوار ہوئیں ایک فریاد کی اور کہا التفات

جان تو ہی ہے؟

اور خود کو جنازہ پر گرادیا، ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا کیا دیکھا کہ بدن خشک ہوگیا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ اس بزرگ ماں نے اپنی جان اسی پیدا کرنے والے کے سپرد کردی۔

میں نے کوچک خانم کی روح قبض کی اور ایمبولینس سے باہر آ گیا۔ ابھی میں اس اژدہام کے سروں کے اوپر سے بھی نہیں گزرا تھا کہ فرض اللہ صاحب نے کوچک خانم کی آدھی کھلی آنکھوں کو بند کیا اور ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ میں نے سنا سید علی اکبر صاحب لوگوں کو خبر دے رہے تھے کہ شہید کی ماں شہید سے جا ملی۔

آرزو

میرے والد نے جنازے پر نشانات و علامات دیکھ کر فوراً اس بات کو تسلیم کرلیا کہ یہ مجید کا جنازہ ہے۔ صورت جلی ہوئی اور کپڑے بھی وہی خاکی رنگ کے جو مجاہدوں کا لباس تھا جو دو سال کے آندھی طوفان جیسے حوادثات سے دوچار ہو کر فرسودہ ہوگیا تھا لیکن ماں کہہ رہی تھیں یہ میرے بیٹے کا جنازہ نہیں ہے۔

میں نے ان سے کہا:

''ماں آپ تو خود یہیں پر تھیں اور آپ نے سنا کہ جستجو کرنے والے گروہ کے افراد نے کہا کہ یہ اسی کا جنازہ ہے''۔

''نہیں میرے بیٹے کا جنازہ نہیں ہے''۔

میں نے کہا:

''مجاہدوں والا وہ کارڈ جو جنگ میں جانے کے لئے گلے میں ڈالتے ہیں بوسیدہ ہو چکا تھا لیکن اس پر لکھا ہوا نام آدھا پڑھنے میں آرہا تھا''۔

''اگر ماں ہوتے تو سمجھتے کہ بیٹے کی خوشبو کیسی خوشبو ہوتی ہے''۔

باپ سے پوچھا:

''کیا کریں؟''

جواب دیا:

''کچھ نہیں، خدا کی رضا پر راضی، ہم کو جنازہ لے کر ادفن کر دینا چاہئے۔

پوچھا:

''ماں کا کیا ہوگا؟''

جواب دیا:

''ان کے لئے بیٹے کی شہادت کو قبول کرنا مشکل ہے اور اب بھی کہتی ہیں کہ یہ جنازہ مجید کا نہیں ہے''۔

ماں نے کہا:

''نہیں میں جانتی ہوں۔ مجید کو شہادت کا بہت شوق تھا۔ اگر شہید ہوگیا تو باعث سعادت ہے اگر زندہ ہے تو انشاءاللہ آئیگا اسکو دیکھوں گی۔ لیکن یہ مجید کا جنازہ نہیں ہے''۔

جستجو کرنے والے گروہ کے ذمہ داروں سے دوبارہ رابطہ کر کے لاشہ کے نشانات معلوم کئے اور پہلے سے زیادہ اطمینان ہوگیا کہ اپنے بھائی کے جنازے کے پاس ہوں۔ واپس آیا اور ساری بات ماں کو بتائی۔

جواب دیا:

''واللہ مجھے نہیں معلوم کیا کہوں''۔

مجید کے جنازے میں لوگوں نے کافی تعداد میں شرکت کی۔ تمام پڑوسی، دوست و احباب، ملنے جلنے والے اور خاص طور سے مجید کے دوست کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس دن خیابان ہاشمی اور خاص طور سے گھر کے نزدیک کی تمام دکانیں سب کی سب بند تھیں تا کہ سب تدفین میں شریک ہوسکیں۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ رضا کار خاکی وردی میں جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سارے پڑوسی اور رشتہ داروں نے شرکت کی تھی۔ صرف تدفین میں ہی اتنا مجمع نہیں تھا بلکہ دوسرے دن

جب علی اکبر مسجد میں مجلس سویم ہوئی تو بھی پوری مسجد سوگواروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں اپنے والد کے پاس کھڑا ہوا لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ مجید کا جنازہ ملے ہوئے تین روز ہو چکے تھے۔ میں تین روز سے شہید کا بھائی تھا۔ لیکن ماں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجید کے کسی ساتھی کی مدد سے اس شخص کو تلاش کروں جو شہادت کے وقت اس کے پاس موجود تھا تا کہ وہ ماں کو مطمئن کر کے ان کا شک دور کر سکے اور ان کے دل کو سکون مل جائے۔ ایک سیکنڈ کو بھی خوش آمدید کہنے سے زبان نہیں رک رہی تھی۔

''خوش آمدید''

محسن نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے کہا:

''خوش آمدید''

اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے اس سے پوچھا:

''تم اور مجید ایک ہی جگہ تھے؟''

جواب دیا:

''آقا رضا، مجید کا جنازہ مل گیا''۔

میں نے جواب دیا:

''ہاں خدا کا شکر ہے جنازہ مل گیا''۔

محسن نے دوبارہ کہا:

''آقا رضا میں کہہ رہا ہوں مجید کا جنازہ مل گیا''۔

جواب دیا:

''ہاں الحمدللہ دفن کے لئے بھی اچھی جگہ مل گئی''۔

محسن نے جواب دیا:

''آؤ رضا چلیں مجید کا جنازہ مل گیا''۔

میں نے پھر پوچھا:

''کہاں؟''

جواب دیا:

''ستادمعراج شہداء۔اگرتم اپنے بھائی کا جنازہ دیکھنا چاہتے ہوتو چلو''۔

میں نے کہا:

''محسن جاؤ بیٹھ جاؤ''۔

جواب دیا:

''آقا رضامحسن کا جنازہ صحیح سلامت مل گیا۔واقعی وہ خودہی ہے۔چہرہ بھی ٹھیک ہے کہیں کوئی زخم نہیں ہے''۔

''اے خدا!''

میں تو چکرا گیا۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں۔محسن اس طرح اطمینان سے بتارہا تھا کہ اگر اس کی بات کو اہمیت نہ دوں تو بھی درست نہیں ہے۔

میں نے پوچھا:

''محسن تم نے خوداپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

جواب دیا:

''ہاں میں نے خوداپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔آج ہم لوگوں نے بہت مزہ کیا۔صبح سے اب تک دوتین گھنٹے ساتھ تھے۔وہ مجھ سے آنکھوں سے باتیں کررہا تھا۔میں نے اس سے کہا تھا کہ جب خدا کے پاس جانا تو دو ٹکٹ خریدنا ہم لوگ ساتھ چلیں گے۔آج صبح مجھ سے کہہ رہا تھا تمہارے لئے ٹکٹ نہیں ملا۔کہاتم ابھی بہت چھوٹے ہو''۔

میں نے اپنے والد کے کان میں کہا:

''آبا جان محسن آیا ہے کہہ رہا ہے کہ مجید کا جنازہ مل گیا ہے اور وہ جس کو دفن کیا گیا ہے مجید نہیں ہے''۔

آہستہ سے پوچھا:

''محسن کیسے جانتا ہے؟''

میں نے کہا:

''وہ کہتا ہے کہ میں نے خود دیکھا کہ آج اس کا جنازہ معراج شہدا میں لایا گیا''۔

پوچھا: ''وہ مطمئن ہے؟''

میں نے کہا: ''اسی طرح کہتا ہے''۔

پوچھا: ''بتاؤ کیا کریں''۔

میں نے کہا:

''اجازت دیجئے میں محسن کے ساتھ جاؤں اور دیکھوں''۔

جواب دیا:

''تم جاؤ میں مجلس چھوڑ کر نہیں جا سکتا''۔

محسن اپنے بہنوئی کے ساتھ مجلس میں آیا تھا اور وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی گاڑی سفید رنگ کی تھی۔ روڈ خالی تھا اور بھیڑ بھاڑ زیادہ نہ تھی۔ تہران کے مغرب سے جنوب تک جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ۳۵ جنازے معراج شہدا لائے گئے تھے۔ محسن کو مجید کے جنازے کی جگہ معلوم تھی۔ ایک دم اس کی طرف گیا۔ تختہ کو ہٹایا، پلاسٹیک کو دور کیا۔ میں نے بے اختیار کہا:

''السلام علیکم یا انصار ابی عبداللہ!''

مجید نے مجھ سے بات کی۔ میں نے اس سے کہا:

''مجید تم انسان ہو گئے۔تم مجھ سے مذاق میں کہتے تھے رضا تو کب انسان بنے گا۔ میں آج آخری جواب تم کو دیتا ہوں کہ تم تو انسان بن گئے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میں کب انسان بنوں گا''۔

جس وقت ہم مسجد علی اکبر واپس آئے مجلس ختم ہو چکی تھی۔تمام لوگ مسجد میں رو بہ قبلہ کھڑے ہوئے تھے اور مکبّر کی آواز کو جو لاؤڈ سپیکر سے آرہی تھی، دہرا رہے تھے۔

''السلام علیک یا ابا عبداللہ''

''السلام علیک یا ابن رسول''

میں اپنے والد کے نزدیک کھڑے ہو کر مہمانوں کو خوش آمدید کہنے لگا۔باپ سے بات کرنے کی ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔انہوں نے آنکھ اور بھوؤں کے اشارے سے پوچھا:

''کیا ہوا؟''

میں نے جواب دیا:

''وہ خود ہی تھا.....خوش آمدید''۔

ہم لوگ گھر پہنچے۔گھر پر زنانی مجلس ختم ہی ہونے والی تھی۔یا اللہ کہہ کر گھر میں داخل ہوئے۔سب لوگ باہری کمرے میں بیٹھ گئے میں نے ماں کو آواز دی:

''ماں!''

ماں کمرے سے باہر آئیں اور پوچھا کیا کام ہے۔

میں نے کہا: ''مجید آپ کا منتظر ہے''۔

پہلے انہوں نے تعجب کیا۔پھر جب میں نے پورا واقعہ بیان کیا تو ماں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھی۔پھول گلشن میں کھلا، کہا:

''مجھے تمام شہید عزیز ہیں۔ میں تمام شہیدوں کو اپنا بیٹا مانتی ہوں لیکن وہ ماں جو اپنے بچے کو نہ پہچانے وہ دیوار میں چنوانے کے لئے ٹھیک ہے''۔

میں نے کہا: ''بہت چالاک ہو''۔

جواب دیا:

''اب مجھے مبارک باد دو۔ اٹھیے چلیں معراج شہدا مجید کی زیارت کے لئے''۔

میں نے کہا:

''ابھی گھر خالی نہیں ہے۔ مہمانوں کا کیا کریں''۔

جواب دیا:

''جلدی چلو معراج شہدا کی طرف''۔

رات کو خاندان کے سبھی لوگ جمع ہوئے اور مشورہ کیا۔ بات یہ طے پائی کہ دوبارہ تدفین کی جائے۔ باپ نے کہا:

''ہم لوگوں کے طلبگار نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو صرف ایک بار تدفین اور ایک بار مجلس کے''۔

والد کے مشورے پر سب لوگ بہشت زہرا میں تدفین کے لئے راضی ہوگئے اور ایک کثیر مجمع کے ہمراہ جو دوسرے شہدا کے تدفین کے لئے بہشت زہرا آئے تھے مجید کو دفن کردیا گیا۔ پرسوں جہاں مجید کو دفن کیا گیا تھا وہ جگہ بالکل پر تھی۔ یہ میرا بھائی مجید تھا جو بہشت زہرا میں دفن ہوا اور اب ساتویں شب کے پروگرام کا انتظار تھا۔

رات کے آخری حصے میں مہمانوں کے جانے کے بعد ماں نے پوچھا: کیا یہ نہیں جاننا چاہو گے کہ میرا وہ بچہ جس کو پرسوں رات دفن کیا اس کی ماں کون تھی۔

میں اور محسن دو دن کی تلاش و کوشش کے بعد اس کو پہچاننے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا نام بھی مجید تھا۔ شہید مجید قطبی۔ ہم اپنے ماں، باپ، محسن اور اس کے بہنوئی کے

ساتھ خیابان بخارا کی طرف گئے۔

باپ نے کہا:

''یہی سڑک ہے''۔

میں نے کہا:

''یہاں شہید خالد اسلامبولی لکھا ہے''۔

بڑے اور اصلی کوچے میں ان کے گھر کا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ گھر کی بیل بجائی۔

ایک سن رسیدہ بزرگ سفید بالوں میں کنگھا کئے اور تازہ داڑھی بنائے ہوئے آئے اور دروازہ کھولا۔ براؤن رنگ کی گاڑی ان کے پیچھے صحن میں کھڑی تھی۔ سلام کیا اور جواب دیا۔ اتنے سارے بن بلائے مہمان دیکھ کر وہ حیران تھے۔

والد نے پوچھا:

''کیا یہ قطبی صاحب کا مکان ہے؟''

جواب دیا:

''میں خود ہی قطبی ہوں۔ فرمایئے''۔

والد نے پوچھا:

''معذرت چاہتا ہوں ذرا یہ بتایئے کیا آپ کے صاحبزادے جنگ کے لئے گئے ہیں؟''

جواب دیا:

''ہاں مجید جنگ کے لئے گیا ہے''۔

والد نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اندر ایک اور گاڑی کھڑی تھی۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایسے گھر کا کوئی فرد جنگ کے لئے جائیگا۔ اس کے باپ نے کہا مجید

نے مجھ سے اجازت نہیں لی بلکہ بھاگ گیا ہے۔

والد نے پوچھا:

"کس طرح گیا خود یا فوج کے ساتھ؟"

اس کے باپ نے جواب دیا:

"نہیں فوج میں نہیں تھا۔ گھروں میں آگ لگا دینے والی اس جنگ کے لئے ہماری کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ اپنی پڑھائی جاری رکھو، میں تمہیں آمریکا بھیجتا ہوں لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ ایک گاڑی اس کے لئے خریدی کہ سرگرم ہو جائے۔ لیکن اس سے وہ فوجی مرکز جاتا تھا اور حزب اللہ کے لئے کام کرتا تھا۔ میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے بعض ساتھیوں نے اس کو پڑھنے لکھنے سے ہٹا دیا"۔

والد نے پوچھا:

"یعنی وہ پڑھتا نہیں تھا؟"

اس کی ماں ایک پیازی رنگ کی چادر اوڑھ کر آئی اور میری ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے کچھ بال آگے سے رنگے ہوئے اور چادر سے باہر تھے۔ وہ کسی طرح میری ماں سے شباہت نہیں رکھتی تھی۔

اس کے باپ نے جواب دیا:

"نہیں، پڑھتا تھا لیکن کہتا تھا میں جنگ میں جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا بیٹا جنگ کو تیری ضرورت نہیں ہے۔ تو پولیس یا فوج میں نہیں ہے تیرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس نے جواب میں کہا جنگ کو میری ضرورت نہیں بلکہ مجھ کو جنگ کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہماری باتیں نہیں سنتا تھا۔ اگر اس مرتبہ وہ واپس آگیا تو مجھے معلوم ہے کیا کروں گا۔

اس کو ایک مختصر سے سفر کے بہانے ایران سے باہر لے جاؤں گا اور اس وقت تک ایران آنے کی اجازت نہیں دوں گا جب تک یہ شورش ختم نہ ہوجائے۔اب اس خراب ماحول میں زندگی گزارنا اچھا نہیں ہے''۔

میرے والد نے میرے بھائی مجید کی شہادت کے بارے میں بتایا اور مجید کے بچپنے کے بارے میں،اس کی پڑھائی کے بارے میں،اس طرح ان کی ذہن سازی کی تا کہ ان کو بتا سکیں کہ ممکن ہے آپ کا مجید بھی زخمی ہوگیا ہو یا پھر درجہ شہادت پر فایز ہوگیا ہو۔

اس کا باپ آپے سے باہر ہو چکا تھا:

''ممکن نہیں ہے۔ میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا اگر میرا بیٹا مارا گیا تو اس کے حزب اللہی دوستوں سے شکایت کروں گا''۔

میرے والد نے ان کو آرام وسکون سے رہنے کی تلقین کی اور ان سے پوچھا:

''کیا آپ کے بیٹے نے کوئی وصیت نامہ چھوڑا ہے؟''

اس کے باپ نے جواب دیا:

''کیا میرا بیٹا تاجر یا کارخانہ دار ہے جو وصیت نامہ چھوڑتا۔اس کا سن ہی کیا ہے!''

اس کی ماں نے کہا:

''جس دن سے وہ جنگ پر گیا ہے میں نے اس کے کمرے کو نہیں کھولا ہے''۔

میری ماں نے خواہش کی کہ چلو ذرا اس کے کمرے میں تو چلیں دیکھیں کوئی تحریر یا کوئی یادداشت ہے۔اس کی ماں میری ماں کے ساتھ ہاتھ میں ایک لفافہ لیکر واپس آئیں۔لفافہ کے اوپر لکھا تھا:

''وصیت نامہ بندہ گنہگار مجید قطبی''

وصیت نامہ کھولا۔لکھا تھا:

"بسم رب الشہدا والصدیقین

میں خدا کا ناچیز بندہ مجید قطبی سرزمین نور کی جانب پرواز کیلئے تیار ہوں۔ میں خداوند عالم کے ایک ہونے کی گواہی دیتا ہوں اور میں وصیت کرتا ہوں کہ:

۱.....۲.....۳.....

آخر میں ماں، باپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے حلالیت طلب کرتا ہوں اوران سے میرا یہ گلہ ہے کہ وہ انقلاب اسلامی ایران اور شہداء کے خون کے موافق نہیں ہیں، لہذا میں ان کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کے جال میں نہ پھنسیں جو انقلاب کے مخالف ہیں بلکہ امام خمینی کے راستے پر چلیں۔

اے خداوند میری ایک آرزو ہے۔اگر میں درجہ شہادت پر فایز ہوگیا تو مجھے یہ توفیق دے کہ میں امت حزب اللہ اور پیروان امام کے ہاتھوں دفن کیا جاؤں اور میں اس بات پر راضی نہیں ہوں کہ میرے ماں باپ دوست و احباب اور پڑوسی جو انقلاب اور امام کے مخالف ہیں میری تشیع جنازہ میں شریک ہوں"۔

والسلام

آخری کارتوس

وہ گروہ ضربت مالک کا کمانڈر تھا۔ اس کا گروہ تمام دیگر جنگجو گروہوں پر حاوی رہتا تھا۔ یہ گروہ اس بات کی اچھی طرح صلاحیت رکھتا تھا کہ اپنے فوجی آپریشن کے دوران دشمن پر کاری ضربیں لگا کر اس پر تسلط حاصل کر لے اسی لئے اس گروہ کے پاس کمانڈوں کی ذمہ داریوں کے علاوہ، یونیورسٹی رزمی گروپ کے کمانڈر کی بھی ذمہ داریاں تھیں۔ اس کے جنگی ساتھی اپنی پریکٹس کے دوران رات کی تاریکی میں بھی اس کو قد وقامت اور ڈیل ڈول سے پہچان لیتے تھے اور اس کی مردانہ آواز سب کے دل موہ لیتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ سب اس کو بوشہری کہہ کر پکاریں۔ علی بوشہری۔ جب کہ بچے اسکول میں اپنے معلم کو آقا مذہبی بوشہری کہتے تھے۔ لیکن وہ لفظ بوشہری کو بہت پسند کرتا تھا۔

علی اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھتا تھا اور نہایت سنجیدہ رہتا تھا۔ وہ ہر فوجی آپریشن میں ایک نئی حکمت عملی اور دور اندیشی کے ساتھ فوج کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور جنگ کی تمام باریکیاں اچھی طرح بھانپ کر سب کو ذمہ داریاں بانٹ دیتا تھا تاکہ سب اپنی اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھا سکیں۔

اس رات بھی علی اپنے کمانڈر کی ہماہنگی سے ایسے مشن پر جا رہا تھا کہ جس میں بہت پیدل چلنا تھا۔ بوشہری نے سب سے پوچھا:

''کسی کو کچھ پوچھنا تو نہیں ہے؟''

سب نے کہا:

''نہیں بھائی۔ہم لوگ حاضر ہیں''۔

علی نے کہا:

''اب آخری حکم''۔

دو تین لوگ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ پہلے والے آپریشن کے حکم کو دہرانا چاہتے ہیں۔اس کی فوجیں اسے اچھی طرح پہچانتی تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ شہید چمران کا شاگرد ہے اور ایک عرفانی بہادر ہے جس کا کوئی بھی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔

دوبارہ سے فوجیوں نے بلند آواز میں کہا:

''ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہیں''۔

بوشہری نے کہا:

''رات کا سناٹا ہے۔آپ لوگ اپنے اپنے دلوں کو خدا کے سپرد کر دیجیے اور صرف اور صرف اس سے لو لگائیے اور اب اگر آپ لوگ تیار ہوں تو میں آخری حکم سناؤں''۔

سب نے کہا:

''حاضر ہیں''۔

بوشہری نے کہا:

''سب کے سب ایک ساتھ میگزین کو اسلحوں سے نکال لیں''۔

ایک دم اسلحوں سے میگزین نکالنے کی آواز فضا میں گونجی۔ پانچ سیکنڈ سے زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا۔اب کسی بھی بندوق میں میگزین باقی نہیں رہ گئی تھی۔

بوشہری نے کہا:

''اب سب کے سب ایک گولی کو میگزین سے نکال لیں''۔

سب کی سانس سینے میں بند ہوچکی تھی اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ کمانڈر سے اس کا مطلب معلوم کرسکے۔فوج تعجب میں تھی۔اس کا حکم بہت ہی تیزی سے بجالایا گیا۔مجمع پر طاری خاموشی یہ بات سب پر عیاں کررہی تھی کہ کسی نے بھی حکم کی نافرمانی نہیں کی۔بوشہری نے کہا:

''اب سب مجاہد کارتوسوں کو اپنی جیبوں میں رکھ لیں''۔

اس حکم کے انجام پانے میں ذرا بھی مشکل نہیں ہوئی۔ایک ایک کارتوس ہر ایک کی خالی جیب میں بنا کسی شور شرابہ کے اپنی جگہ پر سیٹ ہوگیا۔بوشہری نے اپنے حکم کو افسرانہ انداز میں بجالانے کو کہا:

''تمام میگزین رکھ دی جائیں''۔

میگزین رکھنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور تمام میگزین اپنی پہلی جگہ پر رکھ دی گئیں۔

سرد موسم کی ٹھنڈی ہوا لوگوں کے رخساروں سے ٹکرارہی تھی۔رات کا پہلا ہی حصہ تھا اور سردی کی لمبی اندھیری رات اور صرف، دو مدھم روشنی کے چراغ احاطے کو روشن کئے ہوئے تھے۔روشنی اتنی تھی کہ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے۔

سب کے سب حکم کا انتظار کر رہے تھے۔علی بوشہری سب کے سامنے کھڑا ہوا تھا اور خاموشی نے وہاں کی فضا کو بوجھل بنا رکھا تھا اور وہ حیرت کے ساتھ فوج کی جانب نظریں کئے ہوئے تھا اور فوج اس کی آنکھوں کی طرف۔دونوں یہ فکر کررہے تھے کہ ایک دوسرے شہید کی آنکھوں سے آنکھیں ملائے ہوئے ہیں۔کمانڈر کی خاموشی کافی دیر تک

جاری رہی ۔وہ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اپنے گرم آنسوؤں کو صاف کر رہا تھا۔

اس نے آہستہ آواز میں لیکن سنجیدہ ہو کر کہا:

''کچھ لمحوں کے بعد ہمارا آپریشن شروع ہو رہا ہے۔ آج ہمیں لمبا راستہ طے کرنا ہے اور ہم کو چاہئے کہ دشمن کو دور بھگا دیں اور ہم آپریشن کے دوران پوری طرح خاموش رہیں گے اور خاص طور سے جب ہم دشمن کے علاقے میں داخل ہوں تو اس وقت خاموشی کا اور زیادہ خیال رکھیں تا کہ دشمن آگاہ نہ ہو سکے۔ تقریبا آدھی رات کے وقت دشمن پر حملہ کریں گے امید ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے''۔

علی خاموش ہو گیا۔ اس کی فوج کا ایک سپاہی جو اس آپریشن میں پہلی بار شریک ہو رہا تھا اپنے ساتھی سے پوچھا:

''ہم اس ایک کارتوس سے کیا کریں گے؟''

اس نے کہا:

''ہم اس کو تحفہ کے طور پر جنت لے جائیں گے''۔

کمانڈر نے دوبارہ کہا:

''یقینا تم میں سے ضرور کچھ لوگ شہید ہوں گے، ہم کو چاہئے کہ اپنے کام کو انجام دیں، چاہے کامیاب ہوں یا پھر شہید ہو جائیں، جو بھی ہمارے نصیب میں ہے، ہر حال میں ہم کامیاب ہیں۔ آپ لوگوں میں سے جو شہید ہوں وہ ہمارا سلام ابا عبداللہ حسین تک پہونچائیں اور ہماری اور ہمارے دیگر دوستوں کی شفاعت کریں۔ اس کے علاوہ کوئی سوال ہے''۔

اس مختصر سے دس افراد کے مجمع میں سے آواز آئی:

''بھائی علی اس ایک کارتوس کا ہمیں کرنا کیا ہے؟''

علی نے اپنے کمانڈری لہجے میں مطمئن کرتے ہوئے کہا:

''اگر تم مجھے اجازت دیتے تو میں خود تمہیں بتاتا۔کوئی اس ایک کارتوس کو استعمال نہ کرے۔اگر آپ چاہیں تو اسی ایک کارتوس سے مخالف فوج کے ایک کمانڈر کو ہلاک کرسکتے ہیں لیکن پھر بھی اس کو استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتے ہیں''۔

علی تھوڑی دیر خاموش رہااور پھر اسکی حیرانی کو نزدیک سے آتی ہوئی دشمن کی توپوں کی آوازوں نے بے چینی میں بدل دیا جن سے چھوٹی ہوئی بارود زمین و آسمان کو روشن کردیتی اگر ہماری پناہ گاہ کی دیوار حائل نہ ہوتی تو تمام فوجی اور کمانڈر ان کی دوربینوں میں قید ہوجائے۔

بوشہری نے کہا:

''اس ایک کارتوس کی ذمہ داری میری ہے اور اگر مجبور ہوگئے تو اس کوواپس کردینا ضروری نہیں ہے اور اگر زندہ بچ گئے تو اس کو قرارگاہ جہاں ملنے کا وعدہ ہے وہاں واپس کردینا صرف ایک صورت میں اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتے ہو''۔

کان اور تیز ہوگئے۔کچھ لوگ آرام وسکون کے ساتھ کھڑے ہیں وہ لوگ اس سے پہلے والے آپریشن میں کی جانے والی اس کی کارگزاریوں سے واقف تھے۔کمانڈر کو نہ دیکھ پانے کی بناپر چارلوگوں نے اور سر کواوپر اٹھایا اور کمانڈر کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

علی نے کہا:

''اگر زخمی ہوجاؤ یا بنا دفاع کے رہ جاؤ یا پھر دشمنوں کے محاصرے میں آجاؤ تو جس وقت دشمن تمہیں گرفتار کرنے کے لئے تمہاری طرف حرکت کریں

تو اس کارتوس کو بندوق میں ڈال کر، صبر کرنا جب دشمن گرفتار کرنے کے لئے بالکل قریب آجائے تو پھر تم خود دفاع کی حالت میں آجانا اور بالکل آخری لمحات میں کہ جب دشمن پوری طرح تمہارے قریب ہونے والا ہو تو پورے بھروسے کے ساتھ اس ایک کارتوس سے کم از کم ان میں سے ایک دشمن کو ضرور مار دینا۔ انشاء اللہ اس وقت وہ غصے میں آئیگا اور ڈرے گا اور تمہیں بھی گولیوں کا نشانہ بنائے گا۔ تم شہید ہو جاؤ گے اور دشمن کی قید میں گرفتار ہونے سے بچ جاؤ گے"۔

ماں

جب سے ریڈیو پر یہ خبر نشر ہوئی ہے کہ جمعہ کے دن پانچ سو شہیدوں کے پیکر دفن کیے جائیں گے، اسی وقت سے ماں جمعہ کے روز کے طلوع ہونے کے دن گن رہی تھیں۔ جنگ ختم ہوئے آٹھ سال ہو چکے اور دس سال بھائی کو گم ہوئے گزر چکے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس دوران ماں نے سیکڑوں بار معراج شہدا، اسپتالوں اور سرد خانوں کے چکر لگائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

وہ ہمیشہ ریڈیو عراق ضرور سنتی تھیں کہ شاید بھائی کی آواز سننے کو مل جائے۔ یا کوئی خبر مل جائے۔ میں اور میرے والد ان سے گلہ کرتے تھے کہ کب تک تم اس کی تلاش میں رہو گی۔ ماں جواب دیتی تھیں اس وقت تک تلاش و جستجو جاری رہے گی کہ جب تک محمد حسین مطمئن نہ ہو جائے کہ میں نے اس کو بھلایا نہیں ہے اور نہ ہی بھلا سکتی ہوں۔ شروع کے سالوں میں والد بھی ماں کے ساتھ جاتے تھے لیکن ادھر تین چار سال سے وہ ماں کو نصیحت کرنے لگے تھے کہ بس ہے تم اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔ والد نے کہا:

"اگر محمد حسین کی لاش ملنے والی ہوتی تو اب تک کب کی مل چکی ہوتی"۔

لیکن ماں کا نظریہ والد سے الگ تھا۔ وہ کہتی تھیں اگر محمد حسین کو خبر ہو جائے کہ میں اس کے لئے پریشان ہوں اور اس کے چکر میں دوڑ رہی ہوں تو وہ ضرور مجھ سے

ملے گا۔ ہمارے پاس خاموشی کے علاوہ دوسرا جواب نہیں تھا۔ پچھلے دو تین سالوں میں جنازے تلاش کرنے والے مخصوص گروپ کے ذریعے سیکڑوں شہید پہچانے گئے ان دنوں ماں کا کام صرف یہ تھا کہ وہ پہلے والد سے کہتی تھیں:

''آج تم آؤ گے میرے ساتھ محمد حسین کو تلاش کرنے؟''

اور جب وہ سمجھ جاتی تھیں کہ والد کے آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور عنقریب ماں کو بھی جانے سے روک دیں گے تو وہ خود خیابان انقلاب یا بلوار کشاورز کی طرف چل دیتی تھیں اور اس ٹرالی کے کنارے سے جس پر شہدا کے جنازے رکھے ہوتے تھے گزرتی تھیں تا کہ شاید محمد حسین کو پالیں۔

اس بار پیر کو ہونے والے اعلان کے بعد سے آج کی صبح تک ماں بے قرار اور بے چین ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں ان سے پوچھا:

''ماں آج جمعہ ہے کیا شہدا کی تدفین میں جانے کا ارادہ نہیں ہے؟''

ماں نے جواب دیا:

''ضرور جاؤں گی، لیکن بیٹی تم اپنے بھائی کو دیکھنے نہیں جاؤ گی''۔

وہ اتنے اطمینان اور بھروسے کے ساتھ کہتی ہیں کہ میرا دل چاہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔

لیکن اپنی پڑھائی کی وجہ سے جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پہلے بھی وہ اسی اطمینان سے گئی تھیں۔ میں نے کہا:

''نہیں ماں! وقت نہیں ہے''۔

''کیا ہو گیا! تمہارے پاس اتنا وقت نہیں کہ اپنے بھائی کو دیکھ سکو''۔

''کون سے بھائی کو؟ کیوں اس کے پاس وقت نہیں ہے ہمیں دیکھنے آئے۔ کیا دس سال کا عرصہ کم ہے؟ کئی بار گئے اور تلاش نہیں کر پائے''۔

''کوئی بات نہیں بیٹی ! ناامید نہ ہو۔اس مرتبہ بھی پہلے کی طرح چلو''

''معلوم ہے کہ پھر خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا''۔

''نہیں، ہوسکتا ہے اس بار اس کی زیارت ہوجائے ۔چلو کھڑی ہوچلیں''۔

''کہاں ماں''۔

''تمہارے بھائی شہید محمد حسین خشنود کے پیکر مقدس کی زیارت کے لئے''۔

میں خود اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آج پھر پہلے کی طرح مادر گرامی کی حالت غیر فطری ہے۔معلوم نہیں کس چیز کے بارے میں کہہ رہی ہیں اور کیا کہہ رہی ہیں۔لیکن جو بھی ہو ماں ماں ہے اور خاص طور سے جب طبیعت اچھی نہ ہو تو پہلے سے زیادہ ضروری ہے کہ ان کی مدد کی جائے۔

میں بھی ماں کے ساتھ چل پڑی۔ ماں کے چلنے کی رفتار تیز تھی۔شہدا کی ٹرالی کے پاس پہنچ کر، کبھی وہ پیچھے واپس آتی ہیں اور کہتی ہیں مرضیہ پیچھے مت رہ جانا۔ ماں کی نظر ان لکڑی کے تابوتوں پر ہے اور میں ان پر نام پڑھ رہی ہوں اور کبھی وہ گتے پر بنے ہوئے بینر پر لکھے ہوئے ناموں کی طرف نگاہ کرتی ہیں۔کبھی آسمان کی طرف تو کبھی زمین کی طرف۔ چھ ٹرالیوں کے پاس سے گزرنے کے بعد ماں تھک چکی ہیں سر کو نیچا کیا اور تیزی سے ساتویں ٹرالی کے قریب سے گزریں اور آٹھویں تک پہنچی ابھی آدھی ہی ٹرالی کو عبور کیا تھا کہ اچانک ماں رک جاتی ہیں اور دو قدم پیچھے کی طرف واپس آتی ہیں اور کہتی ہیں:

''مرضیہ آؤ دیکھو محمد حسین یہاں ہے''۔

میں نے بہت ہی توجہ سے ان ناموں کے بورڈ پر جو تابوتوں پر چپکے ہوئے ہیں دیکھا۔لیکن خط صحیح سے پڑھنے میں نہیں آرہا ہے۔ایک کاغذ کے اوپر لکھا ہے:

''شہید محمد حسین خشنود تہران''

میں نے کہا:

''ماں آپ صحیح کہتی ہیں''۔

ماں پوچھتی ہیں:

''کون سا ہے؟''

تابوت ماں کو دکھایا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کہا:

''الحمد للہ رب العالمین''۔

میں نے پوچھا:

''لیکن تم نے خود نام والا بورڈ نہیں دیکھا''۔

جواب دیا: ''نہیں''۔

میں نے سوال کیا:

''پھر آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ محمد حسین کا تابوت اسی ٹرالی کے تابوتوں میں ہے؟''

جواب دیا:

''کیا یہ ممکن ہے کہ ماں اپنے بچے کی آواز نہ پہچانے! یعنی تم یہ سوچ رہی ہو کہ میں محمد حسین کی آواز کو بھول گئی ہوں۔ میں پہلے والی تمام ٹرالیوں کے پاس سے گزری لیکن کوئی احساس نہیں ہوا۔ جب اس ٹرالی کے پاس سے گزر رہی تھی تو میں نے بیٹے کی آواز سنی''۔

اس نے کہا: ''ہاں''۔

اسی کی آواز سن کر میں واپس ہوئی اور اسے تلاش کرلیا۔

علی اکبر کی یاد میں

''سلام ابا جان!''

''سلام میرے بیٹے''۔

''معذرت چاہتا ہوں، میں مردم شماری کے لئے آیا ہوں''۔

''خوش آمدید بیٹا، اندر تشریف لایئے، کیا حکم ہے؟''

''صرف کچھ سوالات ہیں''۔

''فرمایئے میں حاضر ہوں''۔

''بابا آپ کا نام؟''

''حسین''۔

''خاندانی نام؟''

''علوی''۔

''آپ کا سال پیدائش؟''

''۱۳۱۰''۔

''شناختی کارڈ نمبر؟''

ماں کی آواز دور سے آرہی ہے:

''حاجی دروازے پر کون ہے؟''

''ابھی آتا ہوں۔ایک صاحب ہیں کہ جن کے کچھ سوالات ہیں''۔

وہ بھی ہم دونوں کے پاس آجاتی ہیں۔اب ان سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ماں آپ کا نام؟

''معصومہ''

''خاندانی نام''؟

.....

ایک ایک کر کے سوالات کا سلسلہ جاری ہے اور میں ساتھ ساتھ جوابات بھی لکھتا جارہا ہوں۔

''آپ کے کتنے بچے ہیں''۔

''صرف ہم لوگ ہیں''۔

''یعنی کوئی بچہ نہیں ہے''۔

''نہیں بیٹا''۔

''یہ گھر آپ ہی کا ہے یا کرایہ کا ہے؟''

''اس دنیا میں سب کرایہ دار ہیں کسی کو جلدی تو کسی کو دیر میں جانا سب کو ہے''۔

''ٹیلی فون ہے؟''

''تھا''۔

''رسوئی گیس؟''

''نہیں''۔

''جلانے، پکانے کیلئے کس چیز کا استعمال کرتے ہیں؟''

.....

''آپ کے گھر میں پکانے کے لئے کیا استعمال ہوتا ہے؟''

کوئی جواب نہیں ملا۔

''معذرت چاہتا ہوں میرا سوال یہ ہے کہ سردیوں میں گھر کو گرم کرنے کے لئے کس چیز کا استعمال کرتے ہیں؟''

میاں بیوی ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں گویا کہ بیوی شوہر کی پیشانی کی شکنوں کو گن رہی ہو۔

''معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے جواب نہیں دیا کہ گھر میں آپ پکانے یا گھر کو گرم کرنے کے لئے کس چیز کا استعمال کرتے ہیں''۔

بیوی اپنی چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے سر نیچے کی جانب کر لیتی ہے اور شوہر میری طرف دیکھتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دوبارہ اس سوال کی تکرار کروں یا نہیں۔ مانا کہ یہ لوگ سن رسیدہ ہیں لیکن سننے میں تو انہیں کوئی مشکل نہیں ہے۔ ابھی ابھی میرے سارے سوالات کا جواب دے چکے ہیں۔ چلئے پہلے میں دوسرے سوالات کر لیتا ہوں پھر دوبارہ اسی سوال پر آجاؤں گا۔

''آپ کے گھر پانی کے لئے پائپ لائن ہے؟''

''جی بیٹا، الحمدللہ پانی کی لائن بھی ہے''۔

.....

دو تین سوال اور پوچھتا ہوں۔ پھر میں اپنے پہلے والے سوال کو دہراتا ہوں:

''آپ سردیوں میں گھر کو گرم کرنے کے لئے کس چیز کا استعمال کرتے ہیں؟''

نہیں پھر کوئی جواب نہیں۔ جب بھی میں اس سوال کی تکرار کرتا ہوں صرف خاموشی ہی خاموشی نظر آتی ہے۔ دوسرے سوالات بھی پوچھتا ہوں اس کے بعد ایک دوسرا فارم اپنے علاقے سے متعلق پر کرتا ہوں۔

''بہت بہت شکریہ''۔

''خدا حافظ بیٹا''

ماں باپ ایک ساتھ ایک آواز ہوکر جواب دیتے ہیں اور آرام کے ساتھ دروازہ بند کرلیتے ہیں۔ مردم شماری کے فارم میں ایک سوال کی جگہ خالی رہ گئی ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔ تین بار سوال کی تکرار کی مگر جواب نہیں پایا۔ چلتا ہوں اب دوسرے گھر کی طرف لیکن ابھی فکر میں ہوں۔

وزارت خانے نے تمام صوبوں کے دفاتر سے صحیح مردم شماری کی تاکید کی تھی اور کہا تھا فارم بالکل ٹھیک سے بھر کر کے جس میں کوئی کالم خالی نہ رہے۔ تہران بھیج دیے جائیں۔ میرے حصے میں اصفہان کا کچھ علاقہ آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کس وقت دوسرے گھر کی گھنٹی بجائی۔ ایک محترمہ نے دروازہ کھولا۔

''سلام''۔

''معذرت چاہتا ہوں مردم شماری کے لئے آیا ہوں اور یہ کچھ سوالات ہیں''۔

''فرمایئے۔ گر سوالات زیادہ مشکل نہیں ہیں تو جواب دیتی ہوں''۔

''صاحب خانہ کا نام''

.....

.....

''خاندانی نام؟''

.....

خوش قسمتی سے اس گھر میں مجھے کسی طرح کی کوئی مشکل پیش نہیں آئی بلکہ خانم کے صحیح اور مطمئن کرنے والے جواب اس چیز کا سبب بنے کہ میں اچھی طرح فارم پر کروں۔اب میں اس فکر میں ڈوب گیا کہ اس سے پہلے والے گھر کے ناتمام جواب بھی انہیں محترمہ سے دریافت کرلوں۔

''بہن جی !معذرت چاہتا ہوں۔کیا آپ بغل والے پڑوسی کو پہچانتی ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ جانتی ہوں۔کئی برسوں سے ہمارے پڑوسی ہیں''۔

''ان کے بچے نہیں ہیں؟''

''اس وقت نہیں ہے''۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ سردیوں میں کمرے گرم کرنے کے لئے کس چیز کا استعمال کرتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی راز ہے''۔

''یعنی کیا؟ کون سا راز ہے؟''

''آپ نے خود ان سے سوال نہیں کیا؟''

''جی پوچھا تھا لیکن جواب نہیں ملا''۔

''یہ کسی کو جواب نہیں دیتے۔لیکن میں جانتی ہوں کہ کیا راز ہے''۔

''شکر گزار ہوں گا اگر آپ میری مدد فرمائیں تا کہ میں اس فارم کو پر کرسکوں''۔

''یہ لوگ سردیوں میں کوئی بھی چیز گھر کو گرم کرنے والی استعمال نہیں کرتے''

''کیا مطلب؟''

''یعنی یہ لوگ ٹھنڈک میں زندگی بسر کرتے ہیں''۔

''لیکن ایسا نہیں لگتا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہے''۔

''نہیں بھائی، مسئلہ اقتصادی حالت کا نہیں ہے۔ان کا اکلوتا بیٹا علی اکبر جنگ میں شہید ہوگیا''۔

''کونسی جگہ؟''

''اجازت دیجئے کہ میں اپنے بیٹے کو بلالوں تا کہ وہ پورا واقعہ بیان کرے''

ماں کو آواز دئے ہوئے ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ بیٹا حمید دروازے پر آیا۔ سلام دعا ہوئی۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی جلد ہی داڑھی مونچھیں اگی ہوں۔ وہی معصوم اور مظلوم سجی چہرہ۔اس نے کہا:

''میں کچھ عرصہ تک علی اکبر کے ساتھ پولیس ٹریننگ کے ایک کیمپ میں تھا''۔

ماں نے کہا:

''حمید بیٹا علی اکبر کے بارے میں بتاؤ''۔

حمید نے کہا:

''۱۳۶۴ میں علی اکبر نے ہائی اسکول پاس کیا۔اس وقت وہ اٹھارہ سال کا تھا۔میں چودہ سال کا تھا، ہم لوگوں نے ایک پولیس ٹریننگ کیمپ بنام افسریہ میں شرکت کی۔ٹریننگ کے بعد مجھے ایلام بھیج دیا گیا اور علی اکبر کو کردستان۔کبھی کبھی ہم چھٹی پر آتے تھے۔وہ ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔لیکن سنہ ۶۴ کی سردیوں سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی''۔

میں نے سوال کیا:

''یعنی وہ شہید ہوگیا؟''

حمید نے جواب دیا:

''ساتھیوں نے بتایا کہ ان کی ڈیوٹی بانہ،سقز اور مریوان کے درمیان واقع کترش پہاڑی پر تھی اور ان کی پناہ گاہ بھی اسی جگہ پر تھی۔ان کے اردگرد کئی کیلومیٹر تک برف ہی برف تھی''۔

حمید اور اس کی ماں نے ایک دوسرے سے نظر ملائی اور سر ہلایا اور ایک سانس لی۔

حمید نے کہا:

''اس وقت بعض دوستوں کی پناہ گاہ ملک کی مغربی پہاڑیوں پر تھی جو برفانی طوفان اور شدید سردیوں کی زد میں تھی۔ یہاں تک کہ امداد رسانی کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ پوری طرح سے امداد رسانی ٹیم کا وہاں سے رابطہ منقطع ہوگیا''۔

میں نے کہا:

''تو اس کے شہید ہونے کی یہ وجہ تھی''۔

حمید نے کہا:

''علی اکبر اور اس کے ساتھی کئی دنوں تک برفیلے طوفان کے محاصرے میں رہے۔ امدادی ٹیم نے ہر چند کوشش کی کہ کسی صورت سے کھانے اور سردی سے بچنے کا سامان ان لوگوں تک پہنچ جائے لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔ آخر کار یہ تین بہادر سپاہی سردی اور بھوک کی شدت سے شہید ہوگئے۔ ایک مہینہ بعد جب موسم کچھ ٹھیک ہوا تو ان تینوں کی جمی ہوئی لاشیں وہاں سے لائی گئیں۔ چار سال سے یہ ماں باپ سردیوں کے موسم میں سردی میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں تا کہ علی اکبر کی یاد کو زندہ رکھ سکیں''۔

ٹیکسی

یہ اربعین کا مہینہ ہے۔ ان دنوں امام حسینؑ کی عزاداری برپا ہورہی ہے اور مجھے تین دن کے لئے لندن آنا پڑا ہے۔ افسوس کہ میں ان دنوں ایران میں نہیں ہوں اور نا ہی ہر سال کی طرح مجالس امام حسینؑ میں شرکت کرسکتا ہوں۔ میں عجیب مصیبت اور پریشانی کا احساس کررہا ہوں۔ لیکن کیا کرسکتا ہوں۔ انگلینڈ میں منعقد ہونے والے اس بین الاقوامی پروگرام میں شرکت کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں اپنے دو دیگر ہم وطن ساتھیوں کے ساتھ پروگرام کے مطابق ان دنوں لندن میں ہوں۔ سرکاری میٹینگ سے فراغت کے بعد جس میں میرے کہنے کے لئے بہت کچھ تھا کہ جو آیندہ میرے اور میرے ملک دونوں کے لئے مفید ہو، لیکن اندرونی کدورت مجھ کو اجازت نہیں دیتی۔ میں نے ٹیکسی لی جو کالے رنگ کی فولکس کی شبیہ اور مینڈک کی طرح تھی۔ قد و قامت کے لحاظ سے ایسا لگتا تھا جیسے یہ ہمارے پر دادا کے زمانے کی ہو۔ میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے بائیں طرف بیٹھا اور میرے دونوں ساتھی پیچھے کی سیٹ پر، ڈرائیور اپنے ملک کے اصول کے مطابق سیدھی طرف آگے کی سیٹ پر اسٹیرینگ سنبھالنے کے لئے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے ٹیپ میں کیسٹ لگائی۔ کیسیٹ کی آواز میرے لئے نامانوس نہیں تھی۔ اس کے دو تین جملہ تو میری سمجھ میں آرہے تھے اور دو تین

جملوں پر میں متوجہ نہیں ہوا۔ پڑھنے والا دو تین جملہ انگلش میں پڑھ رہا تھا اور دو تین جملہ اردو میں۔ جن کی تکرار بار بار ہورہی تھی۔ کچھ کلمہ اردو اور کچھ کلمہ انگلش میں ادا ہورہے تھے۔لیکن ان تمام جملوں کے دوران کچھ الفاظ جیسے زینب، حسین، مصیبت اور شہید ایسے تھے کہ جن سے میں بخوبی واقف تھا۔ میں نے اپنے سر کو اٹھایا تا کہ ڈرائیور سے سوال کروں۔ جیسے ہی اس کی چہرے پر نظر پڑی تو اس کی شکل وصورت ہندوستانی یا پاکستانی سی لگی۔ میں نے اس سے سوال کیا:

''مجھے لگتا ہے کہ تم انگریز نہیں ہو؟''

اس نے جواب دیا:

''پاکستانی ہوں۔اسلام آباد کا رہنے والا۔ میں نے پوچھا کہ کیسٹ میں یہ کیا پڑھا جارہا ہے؟''

وہ مفصلاً انگریزی میں بتانے لگا کہ اس کیسٹ میں حضرت زینب کا ذکر ہے اور خاص طور سے آپ کی شام میں اسیری کا تذکرہ ہورہا ہے۔ دربار یزید کا ذکر ہے کہ حضرت زینب نے تمام مشکلات اٹھائیں لیکن مصائب سے بالکل گھبرائی نہیں اور یزید کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ سب دنیا ہے اور دنیا کی چیزیں ہیں جو ختم ہوجانے والی ہیں اور ہم ہمیشہ رہنے والے ہیں۔تو رسوا ہوگا۔ حقیقی عزت اور عظمت ہمارے لئے ہے۔ تم لوگ ذلیل ونابود ہوجاؤ گے۔

وہ کہے جارہا ہے اور میں سن رہا ہوں۔ راستہ بھی طولانی ہے۔لندن کی تنگ و تاریک سڑکیں بھیڑ سے بھری ہیں جس کے سبب راہ طولانی ہوجاتی ہے اور ٹیکسی کے ڈرائیور سے بات کرنے کا یہ اچھا موقع ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں امام حسین کا چاہنے والا ہوں۔میرا اس ٹیکسی میں سوار ہونا خوش قسمتی کا باعث ہے اور میں محسوس کررہا ہوں گویا کہ امام حسین کی مجلس میں حاضر ہوں تا کہ اس غم سے نجات پاسکوں جوان دنوں ایران

میں نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ڈرائیور نے بھی جب یہ دیکھ لیا کہ مسافر ایرانی ہیں تو اس نے ہم لوگوں کے ساتھ بہت ہی اچھا برتاؤ کیا اور دوسروں کے مقابلے میں ہم لوگوں سے ہمدردی کا زیادہ احساس دلایا۔

ڈرائیور کے سامنے والے آئینہ کے نیچے ایک چھوٹا سا فریم جو کہ برصغیر کا مخصوص نمونہ تھا لٹکا ہوا تھا۔ اس فریم میں سجاوٹ کے درمیان تقریباً دو تین سینٹی میٹر میں یا علی لکھا ہوا تھا۔ اس خط کو وہ تمام ایرانی کہ جو انگلش بھی نہیں جانتے اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ اپنی فارسی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے۔

ڈرائیور نے مجھ سے کہا:

''میں ایک واقعہ آپ سے بیان کرنا چاہتا ہوں''۔

میں نے کہا:

''میں استقبال کرتا ہوں''۔

اس نے کہا:

''ایک ہفتے پہلے ایک انگریز میری ٹیکسی میں آگے کی اسی سیٹ پر بیٹھ گیا کہ جس پر آپ بیٹھے ہیں۔ وہ شخص بلند قامت تھا اور اسکی عمر چالیس سال تھی۔ جیسے ہی وہ سوار ہوا شروع میں تو وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہاں جانا ہے؟ اور چل دیا۔ وہ بیٹھا ہوا گاڑی کو بہت ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس فریم کو جو آئینہ کے نیچے لٹکی ہوئی ہے مجھے دکھا کر پوچھا یہ کیا ہے۔ میں نے کہا علی کا نام اس پر لکھا ہے۔ ابھی میری بات پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے کہا ٹھرو ٹھرو! حالانکہ اسکی منزل مقصود کافی دور تھی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیوں مجھ سے کہہ رہا ہے کہ ٹھرو۔ میں نے ٹیکسی روڈ کے کنارے لگائی اور رک گیا۔ وہ گاڑی سے اترا۔ تھوڑا پیچھے گیا اور پچھلا دروازہ کھول کر دوبارہ سوار ہو گیا اور مجھ سے کہا اب چلو۔

میں نے چلنا شروع کیا لیکن مجھے اس کی اس حرکت پر تعجب ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا ہوا؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔

اس نے جواب دیا:

''اس ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے شراب پی لی تھی۔ مانا کہ میں ایک عیسائی ہوں لیکن علی کا نام ایک پاک اور تاریخی نام ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے منہ کی بدبو اور سانس کی ہوا جو کہ شراب کی وجہ سے ناپاک ہے اس پاک و مقدس فریم تک پہنچے۔ اس لئے میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تا کہ علی کی عزت و حرمت برقرار رہے''۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا:

جس وقت یہ انگریز مسافر اپنی جگہ پر پہنچا تو میں اس کے احترام میں ٹیکسی سے اترا اور خم ہو کر اس کے ہاتھ کو چوما اور اس سے کرایہ بھی نہیں لیا اور خدا حافظی کے وقت اس سے کہا:

''میں تیری اس معرفت کے قربان جاؤں''۔

دو کبوتر

''مجھے نہیں لگتا کہ اجازت ملے گی اور میں ان کو لے جاسکوں گا''۔

''کیوں اجازت نہیں ملے گی۔ اتنے خوبصورت اور پیارے کبوتروں کو''۔

''کیونکہ قانون کے رو سے یں دوسرے ملک میں لے جانا منع ہے''۔

''چھوڑیئے، پہلے اپنے ملک کی سرحد سے تو گزرنے دیں، اس سرحد کا بھی خدا مالک ہے''۔

ان دونوں کبوتروں کا گناہ کیا ہے! یقیناً ان دو کبوتروں کا اشتیاق بھی حضرت امام حسینؑ کے حرم کی زیارت کے لئے ہم لوگوں سے کم نہیں ہے''۔

''ہوسکتا ہے کہ ان کو بھی اپنے ساتھ کربلا لے جاؤں، خدا کو کیا دیکھا ہے''۔

میں خود اپنے آپ سے کہہ رہا ہوں، خود سن رہا ہوں اور خود ہی جواب دے رہا ہوں۔ عراق کی سرحد سے صرف چند کیلومیٹر فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ جیسے جیسے سرحد نزدیک ہورہی ہے شوق زیارت بڑھتا جارہا ہے۔ دوسری طرف ان کبوتروں کے بارے میں فکرمند ہوں۔ جنھیں کئی گھنٹے اپنے کابک اور کاشانہ کو چھوڑے ہوئے ہوگئے ہیں اور اگر شلمچہ میں سرحد پر ان دونوں کو لے جانے کی اجازت نہ ملی تو ان بے گناہ کبوتروں کو اس بیابان میں کس کے سپرد کروں گا۔ راحلہ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اس کے دونوں کبوتروں کو کربلا لے جاؤں اور وہاں جاکر امام حسینؑ کے حرم کے صحن میں

آزادکردوں۔ ماں نے راحلہ کے پیدا ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایک جوڑا کبوتروں کا اس کے لئے لاؤں گی اوراب ایک دو سال سے راحلہ اچھی طرح مانوس ہوگئی تھی اور دل وجان سے عزیز رکھنے لگی تھی لیکن شروع سے ہی دادی کا ارادہ تھا کہ ان کوامام حسینؑ کے حرم کی نذر کردیا جائے۔

میں اسی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ میرے ایک ساتھی نے اشارہ کیا کہ ہم سرحد پر پہنچ گئے ہیں۔ جاڑوں کے موسم کی ایک سردی سے بھری صبح اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بس سے اترنے میں جلدی کریں۔ میرے ہاتھ میں ایک چاندی کا پنجرہ تھا جو خاص طور سے چھوٹے پرندوں کے لئے بنایا گیا تھا جس میں دو سفید نہایت ہی خوبصورت کبوتر تھے۔ بس سے اترے۔ کسٹم ڈیوٹی پر تعینات ایک شخص دیکھتے ہی حیران رہ گیا اور ہنسنے لگا۔ جیسے ہی میرے سامان کے کسٹم کا وقت آیا تو اس نے پوچھا یہ کبوتر کس لئے ہیں؟

میں نے جواب دیا:

''نذر ہے۔ میری بیٹی نے نذر کی ہے اور میں ان کوامام حسینؑ کے حرم لے جارہا ہوں''۔

یہ ایرانی کسٹم آفیسر کہ جس کا سن تقریباتیس پینتیس سال رہا ہوگا بھویں اوپر چڑھا کر اور ہونٹوں کو سمیٹ کر کہتا ہے:

''آپ ان کونہیں لے جاسکتے ہیں''۔

میں نے کہا کیا یہ کوئی ایکسپورٹ کی چیز ہے کہ جس کے لئے لائسنس کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں کبوتر عاشق امام حسینؑ ہیں اور یہ امام حسینؑ کے روضے کی گنبد پر بیٹھ کر نذرانہ عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں''۔

کسٹم آفیسر تھوڑا سر اوپر اٹھاتا ہے اور کہتا ہے:

''مجھے نہیں لگتا کہ تم کبوتر لے جاسکتے ہو''۔

میں نے پوچھا: ''لے جانا عیب ہے؟''

اس نے جواب دیا:

''میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے اس پار یعنی عراق کی سرحد پر تم کو اجازت نہیں ملے گی کہ تم انہیں لے جاسکو''۔

میں نے پوچھا:

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سرحد پر تو کوئی مشکل نہیں ہے''۔

کسٹم والا من من کرنے لگا اور کہنے لگا:

''ٹھیک ہے شاید ہم نے اجازت دیدی۔ لیکن حقیقت میں اس طرح کے کام اچھے نہیں لگتے''۔

عجیب طرح کی باتیں کررہا تھا۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ مگر تو دوسرے ملک کے قواعد وضوابط کا بھی ذمہ دار ہے۔ یہاں سے گزرنے کے بعد کچھ اور زیادہ احتیاط کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔

میں نے سوچا کہ ایک گتے کا کارٹون تلاش کروں اور کبوتروں کو کارٹون میں بند کردوں اور اس میں پلاسٹک کا ایک ہنڈل لگالوں۔ خالی پنجرے کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ ہمارے قافلے کو عراق اور ایران سرحدوں کو پیدل ہی طے کرنا تھا جس وقت میرے سامان کے کسٹم کا وقت آیا میری آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایرانی کسٹم آفیسر جس سے میری بحث ہوئی تھی وہ عراقی کسٹم پر تعینات کسٹم والے شخص کے پاس کھڑا تھا جو لحیم وشحیم کالا اور موٹا تھا۔ عراق کی سرحد پر کام کرنے والا عراقی فارسی جانتا تھا اور تھوڑی بہت فارسی میں بات بھی کرلیتا تھا۔ میں نے اپنا بیگ چیکنگ کے لئے عراقیوں کی میز پر رکھا۔ اس نے پوچھا:

''کفتر؟''

ضرورت نہیں تھی کہ کوئی مجھ سے بتائے میں خود اچھی طرح سمجھ گیا کہ اس نے اس لفظ کو اپنے ایرانی دوست سے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا سیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں منع کرنے کا موقع نہیں ہے کبوتروں کا کارٹون کھولا اور اس کو دکھادیا۔

اس نے کہا: ''لا لا نہیں''۔

میں نے کہا: ''کیا منع ہے؟''

جواب دیا:

''ممنوع، منع ہے''۔

اب ایرانی کی نصیحت سننے کا موقع آیا۔

اس نے کہا:

''تم انہیں یہاں تک لائے ہو یہ لوگ تمہیں اجازت نہیں دینگے کہ تم لے جاسکو۔ مجبوراً انہیں آزاد کرنا پڑے گا۔ پھر کہا میں تم کو نقصان سے بچاسکتا ہوں''۔

میں نے پوچھا:

''کس طرح؟''

جواب دیا:

''ان دونوں کو تین ہزار تومان میں خرید سکتا ہوں''۔

غصہ سے میرا پارہ چڑھ گیا کہ بنی آدم میں کس طرح کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے کسٹم والے تک یہ بات پہنچائی تا کہ وہ کبوتروں کو مجھ سے لے لے۔ میں نے کہا:

''کیا کہا؟''

جواب دیا:

''میں تین ہزار تومان میں ان کو خرید لوں گا''۔

اس کو اس بات کا احساس نہیں کہ ان دونوں کبوتروں کے چھوٹے سے دل میں دو عاشقوں یعنی میری ماں اور میری بیٹی راحلہ کے دل تڑپ رہے ہیں۔ وہ دوبارہ نصیحت کرتا ہے کہ ورنہ آپ کو مجبور ہوکر ان کو آسمان میں آزاد کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا اور میرے ساتھی سعید کا مسلسل اصرار کسی طرح قابل قبول نہیں رہا۔ اور اس عراقی نے کسی طرح ان کو سرحد پار لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ ایک عجیب غم واندوہ اور اضطراب کی کیفیت مجھ پر گزرتی ہے کہ ان دونوں کبوتروں کے دلوں کے ساتھ ماں اور پیاری راحلہ کے جذبات کا بھی خون ہورہا ہے اور ہم سب لوگ ایک ساتھ ایک مشترکہ غم میں شریک ہوجاتے ہیں۔ زیادہ منت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ قافلہ بھی میری وجہ سے رکا ہے۔ ان پانچ غصہ سے بھرے اور پریشان دلوں کو آپس میں ایک جگہ تسلی دیتے ہوئے ڈبہ کھول دیتا ہوں۔ اور ان دو عاشق کبوتروں سے کہتا ہوں جاؤ تمہارا بھی خدا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی آسمان میں اڑتے ہوئے کبوتروں کی جدائی کے غم میں اپنی نگاہ آسمان سے نہیں ہٹاتا ہوں۔ جب تک آسمان میں گم نہیں ہوگئے تب تک انہیں کی طرف دیکھتا رہا اور آنسوؤں کے قطرات کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ ٹوٹے اور مغموم دل سے کسٹم کی میز کے برابر سے نکلا۔ میں نے اپنی آنکھیں اس عراقی اور ہم وطن کی طرف سے ہٹالیں۔

یہاں سے پورے قافلہ کو تقریبا سو ڈیڑھ سو میٹر کا راستہ بس میں سوار ہونے کے لئے پیدل طے کرنا تھا۔ میں قافلہ والوں کے ساتھ پیدل راستہ طے کررہا تھا۔ لیکن دل آسمان میں تھا۔

سعید نے پوچھا:

''خالی پنجرہ کو اب کیوں لارہے ہو؟''

میں نے جواب دیا:

''میں چاہتا ہوں کہ امام حسینؑ کے لئے اس پنجرے کو بطور سند لے جاؤں اوران دو کبوتروں کی خالی جگہ امام کو دکھاؤں''۔

نہایت پریشانی وغربت کے عالم میں بس کے نزدیک پہونچتا ہوں۔ جیسے ہی بس کے نزدیک آیا کیا دیکھا میرے کچھ ساتھی ایک جگہ جمع ہیں۔ اور ایک ساتھی بس کے نیچے نگاہ کرتے ہوئے ہنس رہا ہے۔

سعید نے پوچھا:

''اب مطمئن ہو گئے''۔

میں نے پوچھا:

''کیا ہوا؟''

جواب دیا:

''وہ کبوتر سرحد پار کر کے اپنے کاروان میں آ گئے ہیں اور بس کے نیچے چھپے ہیں تا کہ دوبارہ سے ہمارے ہم سفر ہوسکیں''۔

''آنکھوں سے بے ساختہ اشک جاری ہوئے۔ بے اختیار ہوکر کہا:

''یا حسین!''

پنجرے کو زمین پر رکھتا ہوں۔ اس کا دروازہ کھولتا ہوں۔ کبوتر پنجرے میں داخل ہوتے ہیں اور سفر شروع ہوجاتا ہے۔ غروب کے وقت حرم امام حسینؑ کے صحن میں پنجرے کے در کو کھولا اور وہ کبوتر حرم کی چھت پر اڑنے لگے۔ اس شام سورج کے غروب ہونے کا منظر کبوتروں کی پرواز اور خوبصورتی میرے لئے باعث سکون واطمینان تھی۔

نومولود

جب اس سے دوستی بڑھ گئی تو مجھے اس کے گھریلو معاملات میں دلچسپی پیدا ہوئی لیکن وہ بہت سی باتیں چھپاتا رہا انہیں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ خداوند عالم نے اس کو ایک فرزند عطا کیا تھا جو پیدا ہونے کے کچھ دن بعد اس دنیا سے چلا گیا۔لیکن جب بھی ہم ایک ساتھ شہدا کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے تو راستے میں چھوٹے بچوں کے مخصوص قبرستان سے بھی گزر ہوتا جہاں سے وہ اپنا راستہ بدل کر بچوں کے اس بناتختی والی قبروں کی طرف چلا جاتا اور ایک قبر پر بیٹھ کر آنسوں بہاتا، پھر اٹھ کر چلا جاتا۔

اس قبر کی اسے خوب پہچان تھی۔اگر چہ اس پر کوئی نام وغیرہ لکھا ہوا نہیں تھا۔ تمام نومولودوں کی قبروں کا تقریبا یہی حال ہے۔نہ پتھر، نہ نام، نہ نشانی بہت ہی کم ایسا دیکھنے کو ملا کہ کسی قبر پر پتھر لگا ہوا ہو اور کسی کو معلوم ہو کہ یہ قبر کس کی ہے۔وہاں سناٹا ہی سناٹا رہتا تھا۔لوگ کم جاتے ہیں۔بچوں کو فاتحہ خوانی کی ضرورت نہیں ہوتی اسی لئے فاتحہ خوانی کے لئے بچوں کی قبر پر نہیں جاتا تھا۔میں اس بات پر متعجب تھا کہ کیوں سید مرتضی صاحب بچے کی قبر پر حاضری ضرور دیتے ہیں۔جب کبھی بھی ہم کسی شہید کی قبر کی زیارت کے لئے جاتے ہیں تو وہ بچوں کے قبرستان میں ضرور جاتے ہیں۔لیکن میں نے نہیں دیکھا کہ انھوں نے کبھی فاتحہ پڑھی ہو۔تھوڑی دیر بیٹھے، آنسو بہائے اور

زیرلب دعا پڑھی، ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا کر آمین کہا اور بس۔

اس شخص کی وفاداری میرے لئے دلچسپ تھی۔یہاں تک کہ ان کے سب بچے بڑے ہوگئے تھے، کچھ کی تو شادی بھی ہوگئی تھی مگر وہ بچے کی قبر پر برابر جاتے رہتے ہیں۔اس حساب سے تو اسکے بچے کو اس دنیا سے گزرے ہوئے برس ہا برس گزر چکے ہیں۔حقیقت میں یہ اس سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتا ہوگا،ایک دن مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں نے ان سے پوچھ ہی لیا:

''سید صاحب آپ فاتحہ تو پڑھتے نہیں پھر اس کی قبر پر کیوں آتے ہیں؟''

سید مرتضی صاحب نے کہا:

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ان کو فاتحہ کی ضرورت نہیں ہے''۔

میں نے کہا:

''یہ بات اپنے آپ کو سمجھایئے جو کئی سالوں سے اپنے مرحوم نوزاد کی قبر پر آتے ہیں اور گریہ کرتے ہیں''۔

جواب دیا:

''نہیں زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں تقریبا ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے''۔

میں نے کہا:

''لیکن آپ کے سارے بچے تو بڑے ہوگئے ہیں اور آپ کے چہرے سے نہیں لگتا کہ ادھر جلدی میں آپ کے گھر کوئی بچہ پیدا ہوا ہے''۔

جواب دیا:

''میرا ہی پارہ جگر ہے''۔

میں نے پوچھا:

''واقعا نومولود تھا؟''

جواب دیا:

''نہیں لوگوں کے سن و سال کا تھا''۔

پوچھا:

''اس کا نام کیا تھا؟''

جواب دیا:

''نام نہیں تھا''۔

پوچھا:

''یعنی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ اسکا نام رکھا جاتا''؟

جواب دیا:

''نہیں اتفاق سے بیس سال سے زیادہ عرصے سے اس زمین پر چلتا پھرتا تھا''۔

میں نے کہا:

''بات کیا ہے؟''

جواب دیا:

''اگر تم بھی میری جگہ ہوتے تو اسی طرح پریشان رہتے''۔

میں نے کہا:

''میں نہیں سمجھا موضوع کیا ہے؟ اور میں کس بات سے پریشان ہوجاتا''۔

سید مرتضی صاحب نے کہا:

''اگر اپنے جگر پارے کے ایک ٹکڑے کو خود اپنے ہاتھ سے یہاں دفن کرتے''۔

میں نے کہا:

''کیا یہ ممکن ہے وضاحت کے ساتھ بتائیں''۔

جواب دیا:

پچھلے سال مہر کا مہینہ تھا بیٹے کو شدید زخمی حالت میں میدان جنگ سے تہران منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے علاج میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں کی ،لیکن ان دنوں بھی آج کی طرح جنگ اپنے شباب پر تھی۔ روزانہ زخمیوں کو کافی تعداد میں میدان جنگ سے آس پاس کے شہروں کے اسپتالوں میں علاج کے لئے منتقل کیا جاتا تھا۔کبھی کبھی تو اسپتالوں کی بالکونی اور راستے تک جنگ میں زخمی افراد سے بھر جاتے تھے۔اس وقت تک ایران نے میڈیکل میں آج جیسی ترقی نہیں کی تھی کہ اتنی آسانی اور حفاظت سے زخمیوں کو میدان جنگ سے لایا جاسکتا کیونکہ زخمیوں کی تعداد ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔

مختصر یہ کہ ایک روز ڈاکٹر نے مجھے سمجھایا کہ اگر آپ کے بیٹے کے پیر کو ران کے نیچے سے کاٹا نہیں گیا تو اسکی موت ہوسکتی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے پیر کو ران سے جدا کرنے والے اقرار نامے پر دستخط کردیے۔ یہ وہی مزار ہے جہاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کے پیر کو دفن کیا ہے۔

عزاداری

''ژرژ، آؤ دیکھو۔ یہ گھر دوبارہ سے بس رہا ہے''۔

''کیا ہوا۔ میں نے سنا نہیں، کیا کہہ رہے ہو؟''

''آؤ دیکھو مسلمان پھر اس گھر میں جمع ہو رہے ہیں، دیکھ چھوٹے اور بڑے سب اس گھر میں جا رہے ہیں''۔

''جا رہے ہیں تو جانے دو۔ ہم سے کیا لینا دینا۔ جاؤ اپنا کام دیکھو''۔

''ژرژ، ہم کو پتا چلنا چاہئے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ کون سا کھیل ہے۔ کون سی پیکچر ہے جو صرف مسلمانوں کے لئے ہے''۔

''مان لو ہم نے پتا لگا بھی لیا لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ۔ یہ مسلمانوں کا کام نہیں ہے بلکہ شدت پسندوں کا کام ہے''۔

''کون شدت پسند؟''

''وہی شیعہ، میں نے سنا ہے کہ شیعہ مسلمان شدت پسند ہیں اور کئی صدیوں سے حسین کے قتل پر آنسو بہا رہے ہیں اور عزاداری کر رہے ہیں''۔

''آخر اس کا عزاداری سے کیا تعلق ہے! یہ تو ایک عجیب و غریب فلم، کمیڈی، ٹریجڈی یا ڈراما ہے''۔

''میں نہیں سمجھا۔ یہ کمیڈی ٹریجڈی کیا چیز ہے؟''

''تم اس کام کو جو یہاں ہو رہا ہے کیا نام دو گے؟ ڈرامہ بھی کہہ سکتے ہیں، کمیڈی بھی اور ٹریجڈی بھی''۔

''چرق! چرق!''

ژرژ اسمیت کے گھر کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز نے اس کی اور اس کی بیوی مری رابنسن کی بحث کو ختم کر دیا۔

''دیک، جاؤ دیکھو کیا ہو''۔

دیک گیا اور فوراً واپس آ گیا۔

''مامی! بائیں طرف والی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگتا ہے گلی میں کھیل رہے بچوں نے پتھر مارا ہے''۔

ژرژ اور مری خود گلی میں آتے ہیں اور گھر کے کنارے والی کھڑکی کو دیکھتے ہیں شیشہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ بچوں کا کھیل چھوڑ کر تعجب سے دیک اور اس کے ماں باپ کی طرف دیکھنا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ ان ہی کا کام ہے۔

مری نے کہا:

''میں ان پڑوسیوں سے شکایت کروں گی''۔

ژرژ نے کہا:

''عقل سے کام لو، مری، کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آیا ہے''۔

اس نے کہا:

''اتفاق سے یہ بہترین موقع ہے۔ میں اب جاننا چاہتی ہوں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے''۔

''امید ہے کہ کامیابی ملے گی''۔

''ژرژ تم خود گواہ ہو کہ کہ آج شام سے اب تک تقریبا سو افراد یا اس سے بھی زیادہ ہمارے سامنے والے گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ ابھی بھی تم دیکھ رہے ہو کہ چراغ خاموش کر رکھے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا ہے یہ تمام کہ تمام کہاں سمائے ہوں گے؟''

اپنے پڑوسی سے ژرژ کی بیوی کی شکایت عدالت تک پہنچ جاتی ہے۔جناب مرتضوی، صاحب خانہ کے وکیل بن کر عدالت میں داخل ہوتے ہیں یہ ان ایرانیوں میں سے ہیں جو بیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔مرتضوی کا اپنا گھر ہمستد علاقے میں ہے لیکن اس گھر کی ساری ذمہ داری جو کنزیگٹون میں واقع ہے یں کے سپرد ہے۔ آپ نے اس عرصے میں مسلمانوں اور خاص کر لندن میں مقیم ایرانی شیعوں اور ایک مرجع تقلید کے مالی تعاون سے اس گھر کے پیچھے والے تین گھروں کو خریدا اور ان کے درمیانی دیواروں کو توڑ کر ایک بڑا حال پروگراموں اور خاص کر محرم اور صفر میں امام حسینؑ کی عزاداری کے واسطے بنا دیا ہے جس کا صرف ایک دروازہ گلی میں ہے۔

ادھر کچھ سالوں سے یہ مرکز شیعوں اور دیگر مسلمانوں کے لئے جو اہل بیت عصمت سے محبت رکھتے ہیں پناہ گاہ بن گیا ہے۔ ائمہ معصومینؑ کی ولادت اور شہادت کی مناسبت سے پروگرام ہوتے ہیں جسے امام حسینؑ کے چاہنے والے بہت پسند کرتے ہیں اور جن میں ایرانیوں کے علاوہ ہندوستانی، پاکستانی، مصری، عراقی اور دیگر ممالک کے مسلمان بھی کافی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔

فیصلہ کا دن آیا۔جج نے اسمیت فیملی کے حق میں فیصلہ سنایا اور مرتضوی صاحب کو پڑوسی کے شیشے توڑنے کے جرم میں قصوروار ٹھراتے ہوئے جرمانہ بھرنے کو کہا۔مری نے مسٹر جونز لوکل عدالت کے جج سے کہا:

''لیکن ابھی ایک چیز باقی ہے''۔

ژرژ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:

''نہیں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ چھوڑیئے''۔

مری نے کہا:

''مسٹر جونز میں اس بات کو مانتی ہوں کہ مقدمہ ختم ہوگیا اور اب کچھ باقی نہیں رہا۔ پھر بھی اگر ممکن ہو تو اس گھر سے متعلق کچھ غلط فہمیاں اگر دور ہوجائیں تو بہتر ہے''۔

جج نے مرتضوی کی طرف رخ کر کے کہا:

''پڑوسی آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اس سے قبل مجھے بتایا تھا لیکن یہ شخصی سوال ہیں اس مقدمہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے''۔

مرتضوی صاحب نے کہا:

''کیا سوالات ہیں؟''

مسٹر جونز نے کہا:

''آپ کے پڑوسی اس گھر میں ہونے والے کاموں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں لیکن آپ کو یہ اختیار ہے کہ جواب دیں یا نہ دیں''۔

مرتضوی صاحب نے کہا:

''فرمایئے''۔

جج نے کہا:

''یہ پڑوسی کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے والا مکان ایک پرانا مکان ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ یہاں کوئی رہتا بھی نہیں ہے، کوئی بورڈ وغیرہ بھی نہیں لگا ہے تا کہ ہم سمجھ لیں کہ یہ کیا ہے۔ ظاہر میں تو یہ صرف ایک گھر ہے لیکن سال کی کچھ راتوں میں بہت سے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں ہم حیران

ہیں کہ اتنے لوگ ایک گھر میں کیسے سماتے ہیں اور ان لوگوں کا یہاں آنا ہمیشہ معین راتوں میں نہیں ہے اور اس میں فصلوں اور مہینوں کے حساب سے تبدیلی آتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو مسلسل کئی راتوں تک ہر رات آتے ہیں اور عجیب وغریب پروگرام ہوتا ہے اور کبھی یہ سلسلہ دس راتوں تک چلتا رہتا ہے۔

آپ کے پڑوسیوں کو آپ کے ان پروگراموں سے کوئی پریشانی بھی نہیں ہے اور کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمانوں کے بچے، بوڑھے اور جوان اس گھر میں جمع ہوتے ہے۔ ہم لوگ سنتے ہیں کہ پہلے ایک آدمی ترنم میں کچھ پڑھتا ہے۔ ہم گلیوں سے دیکھتے ہیں کہ اچانک چراغوں کو خاموش کردیا جاتا ہے اور اندھیرے میں ایک دوسرے کی پٹائی کرتے ہیں ہم مارپیٹ کی آواز کو اچھی طرح سنتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو گریہ و زاری بھی کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ چاہا کہ ہم ان کی مدد کے لئے جائیں لیکن پچھلے پروگراموں کے تجربات ہم کو اس میں مداخلت کرنے سے روک دیتے ہیں۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ پیٹنے پٹانے اور گریہ و زاری کے بعد لائٹ جلادی جاتی ہے پھر پلیٹوں، چمچوں اور کانٹوں کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ ایک ساتھ ایک دسترخوان پر کھانے میں مشغول ہیں۔

اور آخری شک آپ لوگوں پر آپ کے پڑوسیوں کا یہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ کھانے کے بعد سب لوگ باہر آتے ہیں ہنستے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں اور بہت ہی خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کو آنے والی رات یا سال کی ایک نامعلوم رات تک کے لئے خدا حافظی کرتے ہیں۔

آپ اس عجیب وغریب کاموں کے سلسلے میں کیا بتائیں گے؟''

مرتضوی صاحب اپنے کاندھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ یہ لوگ امام حسینؑ کی عزاداری اور سینہ زنی کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں۔ مرتضوی صاحب نے ان سے خواہش کی کہ وہ بیٹھیں اور سنیں۔ پھر انہوں نے اچھی طرح اس عزاداری کے پروگرام کے بارے میں بتایا۔

زیارت

جب سے میرے والد شہید ہوئے ہیں، ماں کی ایک عجیب سی کیفیت ہوگئی ہے۔ وہ گھنٹوں دعا اور نماز میں مشغول رہتی ہیں۔ والد کی روح سے بات کرتی ہیں اور ان سے مدد طلب کرتی ہیں۔

والد کی شہادت کو تقریباً دو سال گزر چکے ہیں۔ میدان جنگ، پہلے سے کہیں زیادہ جاں بازوں کا طلبگار ہے۔ میرے بھائی محمود نے والد کی وصیت نامہ کے ایک جملے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسے بھی جنگ پر جانا چاہئے لیکن میں اس چیز کو قبول نہیں کرتا۔ ماں محمود کے اس نظریہ پر خاموش ہیں اور انہوں نے کبھی بھی اپنی موافقت یا مخالفت کا اعلان نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کہتی ہیں میں تم دونوں بھائیوں کی سعادت چاہتی ہوں۔ چاہے جنگ میں ہو یا شہری زندگی میں۔ شہید ہو جاؤ یا میرے پاس رہو۔ وہ کہتی ہیں:

"تم دونوں اپنے باپ کی نشانی ہو اور میں کوشش کروں گی کہ میرے ساتھ رہنے سے کہیں تم یاد خدا سے غافل نہ ہو جاؤ۔ تم لوگوں کو اپنے دین اور ایمان پر فدا ہونا چاہئے۔ امام زمانہ کے اچھے دوست بنو"۔

وہ ہر نماز کے بعد قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑی ہوتی ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ، ان کی بیٹی فاطمہ زہرا (س)، امیر المومنینؑ اور دوسرے اماموںؑ یعنی ساتویں امام تک سلام کرتی ہیں۔ پھر وہ بائیں طرف پلٹ کر امام رضاؑ کو سلام کرتی ہیں پھر دوبارہ قبلہ کی طرف

پلٹ کر دوسرے اماموں کو سلام کرتی ہیں اور خاص طور سے وہ امام زمانہؑ سے کچھ باتیں کرتی ہیں۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ زندہ اور ظاہراً دنیا سے چلے جانے والے اماموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ لوگ ہم کو دیکھتے ہیں اور ہماری باتوں کو سنتے ہیں وہ جس وقت امام زمانہؑ سے زیارت کی زبان میں بات کرتی ہیں تو کبھی مسکراتی ہیں اور کبھی سنجیدہ ہوجاتی ہیں۔ کبھی تیز تیز بات کرتی ہیں اور کبھی آرام اور نرمی کے ساتھ اپنا دردِدل بیان کرتی ہیں۔

چار مہینے بیت چکے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں محمود بھائی بھی جنوبی ایران کے میدان جنگ میں جہادیوں کے ساتھ چلے گئے۔ جب سے بھائی میدان جنگ میں گئے ہیں وہ مجھ سے کہتی ہیں کہ بس یا ٹرین کا ٹکٹ بک کراؤں اور ان کو مشہد لے جاؤں۔

میں کہتا ہوں:

''ماں گرمی ہے اور بھیڑ بھی ہے۔ ابھی مناسب نہیں ہے۔ موسم خزاں میں جب ہوا تھوڑی ٹھنڈی ہوجائیگی اور بھیڑ بھی نسبتاً کم ہوجائے گی تو بہتر ہے''۔

وہ کہتی ہیں:

''حسن جان ایسا لگتا ہے کہ تم بھول گئے کہ میں نے تمہارے باپ کی شہادت کے بعد عہد کیا تھا کہ ایک بار ان کی نیابت میں امام رضاؑ کی زیارت کروں گی''۔

آج مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے نہیں چاہئے کہ ایک زیارتی سفر کے لئے ماں کو اس سے زیادہ انتظار کراؤں۔ میں نے بس کے دو ٹکٹ خرید کر ماں سے کہا:

''ماں! آپ تیار ہوجائیں پرسوں ہم لوگ چلیں گے''۔

راستہ لمبا ہے اور ہوا گرم۔ وہ تو بس میں بھی اپنے حجاب کے فکر میں ہیں پسینہ ٹپک رہا ہے تھکی ہوئی ہیں لیکن ذکر سے غافل نہیں ہوتیں کبھی وہ اپنے آنسوں کو صاف

کرتی ہیں۔طولانی راستہ، گھنٹوں کا سفر گرمیوں کا موسم ہم جیسے جوانوں کا حوصلہ پست کردیتا ہے لیکن ماں کی زبان پر ایک شکایت کا حرف نہیں ہے۔

اس تھکادینے والے سفر کے بعد ایک پرانے گھر میں ایک معمولی سا کمرہ حرم کے سامنے والی سڑک پر لے لیا۔ ماں حرم جانے کے لئے جلدی نہیں کرتیں۔ مجھ سے کہتی ہیں اگر تم تھکے ہوئے ہو تو تھوڑا آرام کرلو۔ خود غسل زیارت کرکے پاک و صاف کپڑے زیب تن کرتی ہیں۔ میں ایک ذرا سی نیند لینے کے بعد ماں کے حرم جانے کی خوشی اور ان کے شگفتہ چہرہ و رخساروں کا گواہ ہوں۔ ٹیکسی لینے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہم حرم کے بڑے صحن کے پاس اترے ماں نے مجھ سے کہا بھائی کی طرف سے بھی زیارت کرلینا۔

وہ اور میں دونوں آہستہ آہستہ حرم کے صحن کے بڑے دروازے پر پہنچے۔ میں دو سیڑھیاں نیچے اترتا ہوں۔ زائروں کی سنت کے مطابق تھوڑی دیر توقف کرکے ہاتھ سینہ پر رکھ کر امام رضاؑ کو سلام کرتا ہوں۔ میں چلنا چاہتا تھا کہ دیکھا ماں کھڑی ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے سلام کو اور طولانی کیا تا کہ ماں آجائیں۔ ماں سے دو تین قدم ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اب یہ سوچ کر بہت خوش ہوں کہ کچھ دیر بعد امام کے حرم میں داخل ہوکر امام کی زیارت کرینگے۔ اسی فکر میں دو تین قدم اور آگے بڑھ گیا۔ دیکھا کہ ماں میرے ساتھ نہیں ہیں۔ واپس آیا اور ان کو اسی سیڑھی پر کھڑا ہوا پایا۔ تھوڑا صبر کیا تا کہ وہ اپنے سلام کو تمام کرلیں اور پھر چلیں اور اندر جاکر امام رضاؑ کی زیارت کریں لیکن زیادہ انتظار میں بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ماں جہاں کھڑی تھیں وہیں کھڑی ہیں۔ میں ان سے ذرا فاصلہ پر کھڑا ہوں اگر میں ان کو آواز دوں تو زور سے دوں اور یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ حرم میں زور سے آواز دی جائے۔ خود اپنے آپ سے کہتا ہوں چھوڑو آواز کی ضرورت نہیں ہے تھوڑا انتظار کرلو وہ خود آجائینگی۔ نہیں زیادہ انتظار بھی

مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ میں واپس جاتا ہوں اور ماں سے کہتا ہوں :

''ماں کب تک آپ یہاں کھڑی رہیں گی۔ چلئے حرم کے اندر زیارت کے لئے''۔

جواب دیا: ''کیا تم نے زیارت نہیں کی؟''

''انشاء اللہ ابھی چلتے ہیں اور زیارت کرتے ہیں''۔

''زیارت کے لئے کہاں جاؤ گے؟''

''حرم کے اندر''

ماں نے کہا:

''کس لئے؟''

میں نے ان کی بات پر تعجب کیا۔انہوں نے کہا:

''چلو ہم گھر واپس چلتے ہیں''۔

میں نے پوچھا:

''کون سے گھر؟ کیا ہم لوگ زیارت کے لئے نہیں آئے ہیں؟ کیا تین چار مہینے سے آپ کا مسلسل یہ اصرار نہیں تھا کہ میرے مشہد کے سفر کا انتظام کرو!اور اب یہیں سے واپس جانا چاہتی ہیں۔ کیا آپ زیارت نہیں کریں گی؟''

''بیٹا مگر تم نے زیارت نہیں کی؟''

''ابھی تو ہم حرم بھی نہیں گئے''۔

ماں نے جواب دیا:

''میں یہاں کھڑی تھی میں نے کہا اے علی بن موسی الرضاؑ السلام علیکم! میں دور سے آپ کی زیارت کے لئے آئی ہوں اور اپنے شہید شوہر کی نیابت

یعنی بدلے میں۔ امام رضا ایک پاکیزہ لباس، سبز عمامہ اور نورانی چہرے میں میرے سامنے آئے، میرے سلام کا جواب دیا اور مسکرا کر رضایت کا اعلان کرتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ تمہاری زیارت قبول ہوگئی۔ لیکن تم نے امام رضاؑ کو نہیں دیکھا؟ یہیں کھڑے ہوئے تھے! اب ہم اپنے وطن واپس چلتے ہیں"۔

میں حیران رہ گیا میری زبان بند ہوگئی۔ مجھ میں نہ واپسی کی ہمت ہے نہ رکنے کی۔ کاش میں ان کے احساسات کو سمجھ سکتا اور وہ کیفیت جو ان کے دل میں تھی تھوڑی سی میرے دل میں بھی آجاتی۔

ڈیڑھ جوڑ

حسین نے کہا:

''اس مرتبہ آپ خود آیئے''۔

باپ نے پوچھا:

''کہاں؟''

حسین نے جواب دیا:

''جوتے جمع کرنے کی جگہ پر''۔

باپ نے سر ہلایا اور کہا:

''کیوں؟''

حسین نے شرم سے کہا:

''جب بھی جوتے جمع کرنے جاتا ہوں تو پریشان ہوجاتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کیا کہوں''۔

باپ جنگ میں زخمی ہوگئے تھے۔ سیدھی ٹانگ زانوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ان کو صرف ایک جوتے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جب ایک ساتھ زیارت کے لئے جاتے تو حسین کو مجبوراً تین جوتے، جوتے رکھنے والے کے حوالے کرنے پڑتے تھے۔ ایک جوڑا اپنا اور صرف ایک جوتا اپنے باپ کا۔

اس دن تک اس نے باپ سے کچھ نہیں کہا تھا اور خود کسی نہ کسی طرح سے اس صورت حال کو ٹھیک کرنے میں لگا تھا۔ لیکن اب اس میں لوگوں کی متعجب نگاہوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی اور یہ جوتے جمع کرنے والے بھی کبھی اس کو نہیں پہچانتے تھے۔

گذشتہ شب جمعہ کو بھی وہ ساتھ گئے تھے۔ اس رات بھی باپ نے ہمیشہ کی طرح صحن کے سامنے کھڑے ہو کر ایک جوتا اتارا اور حسین کو دیا اور خود برابر والے دروازے سے حرم میں داخل ہو گئے۔ بابا کے پاس ایک جفت عصا بھی تھا اور وہ مجبوراً جس طرف بھیڑ کم ہوتی تھی اس راستہ سے جاتے تھے تا کہ لوگوں کا سیلاب ان کو زمین پر نہ گرادے۔ اس رات حسین نے تین جوتے، جوتے جمع کرنے والے کو دئے۔ اس نے جوتوں کی طرف دیکھا اور حسین سے کہا:

''ایک اور کہاں ہے؟''

حسین نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا:

''بس یہی ہیں''۔

جوتے جمع کرنے والے نے حسین کی بڑبڑاہٹ سے کچھ نہیں سمجھا اور بے دلی سے پوچھا:

''کیا کہہ رہے ہو؟ دیکھو شاید کہیں گر گیا ہو؟''

حسین نے بلا وجہ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ پریشان ہو چکا تھا اور جوتے جمع کرنے والوں سے ڈرنے لگا تھا۔ اس نے حسرت سے لوگوں کی طرف دیکھا سب کے پاس ایک ایک جوڑ جوتے تھے اور بنا کسی دردسر کے وہ اپنے جوتے، جوتے جمع کرنے والے کو دے رہے تھے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے والد کے پاس بھی ایک جوڑ جوتا ہوتا۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہے:

''اے خدا میرے والد کے کیوں ایک پیر ہے؟ اور کیوں ان کے پاس صرف ایک جوتا ہے''۔

وہ دیوار پر تکیہ کیے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ان لوگوں کو جو آ جا رہے تھے اور سب کے ہاتھ میں ایک ایک جوڑی جوتے کی تھی۔ آرام وسکون کے ساتھ جوتے، جوتے جمع کرنے والے کو دیتے ہیں اور واپسی کے وقت لے لیتے ہیں۔لیکن جب اس کے والد کا نمبر آتا تھا تو اس کا بدن لرزنے لگتا تھا۔حسین کو جواب دینا تھا۔ جوتے والے کی تھکی ہوئی اور متجسس نگاہوں میں دیکھ کر کچھ کہنا تھا۔دوسری طرف اس کے والد اس کا انتظار کر رہے تھے کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اسلئے جلدی سے وہ جوتے دیکر جانا چاہتا تھا۔کبھی وہ چاہتا تھا کہ کوئی بہانہ کر کے اس کام سے بچ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔وہ بابا کی بات کو کاٹنا نہیں چاہتا تھا۔وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ خود ہی جوتے کنفشدار کو دیدیں۔اگر والد جوتا دینے کے لئے گئے اور خدا نا خواستہ بھیڑ کی وجہ سے زمین پر گر گئے تو کیا ہوگا، اسے دکھ بھی ہوگا اور بابا کے بھاری بدن کو زمین سے اٹھانا پڑے گا۔نہیں اگر کچھ ہوگیا تو اس زخمی بدن اور کٹے پیر کے ساتھ گھر سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔پھر زیارت کے لئے جانا بھی بند ہو جائے گا۔سب کو معلوم ہے کہ حسین کو حرم جانا کتنا پسند ہے۔

اس رات وہ دودل تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کنفشداری کا چکر چھوڑ کر جوتوں کو اپنے ساتھ حرم میں لے جائے۔ گیلری سے گزرا۔حرم کے نزدیک پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے ہاتھ تو باپ کے مدد کے لئے ہیں۔قرآن لانے کے لئے،ضریح میں پیسے ڈالنے اور عصا وغیرہ اٹھانے کے لئے اور دوسری بات یہ کہ بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ حرم ایک پاک ومقدس جگہ ہے اور اس جگہ کا احترام ضروری ہے۔ جوتے لیکر اندر نہیں جانا چاہئے۔

وہ حیران تھا کہ کیا کروں۔ ایک بلند قامت شخص تیزی سے آیا اور اسے ٹکر ماردی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ میں نے پیچھے سے اس کو دیکھا یقیناً یہ نماز جماعت کے خاطر جلدی میں تھا۔ اس نے اپنی ایک چپل حسین کے پاس اتاری ور دوسری ذرا فاصلہ پر۔

اچانک حسین کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے مشکل کا حل تلاش کرلیا تھا۔ اس کے والد بتاتے تھے کہ جس وقت میں مسجد الحرام میں داخل ہوتا تو اپنی چپل کو دو الگ الگ جگہ رکھتا تھا یعنی ایک چپل ایک خانے میں اور دوسری، دوسرے خانے میں، ایک دوسرے سے دور۔ زیادہ تر چپلیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور حجاج دھوکے میں ایک دوسرے کی چپل اٹھالیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک چپل دھوکے میں نہیں اٹھاتا کیونکہ ایک چپل کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زیارت کے بعد چپلوں کو الماری کے خانوں سے نکال کر پہنتا اور آرام سے ہوٹل کی طرف چل دیتا۔

حسین اپنے دل میں سوچ رہا ہے۔ میں اپنے جوتے کفشدار کو دے دوں اور بابا کے جوتے کو گیلری میں ڈال دوں۔ پھر دھوکے میں بھی کوئی اس کو نہیں لے جاسکتا ہے۔ اسی فکر میں کفشداری کی طرف پلٹ آیا۔

"جناب... جناب"

"لاؤ اپنے جوتے مجھے دے دو"۔

حسین دوبارہ خاموش ہوگیا اور وہ جو راہ حل تلاش کی تھی اس کے صحیح ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے والد کا جوتا کوئی لے جائے۔ شاید حرم کی صفائی کرنے والے اس کو اٹھا کر کوڑے دان میں ڈال دیں۔ تو پھر میں والد کو کیا جواب دوں گا"۔

حسین بابا کے جوتے کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ شاید دوسروں کی نظر میں وہ صرف ایک معمولی سا جوتا ہو لیکن حسین کے لئے دوسری بات تھی۔ اگر یہ جوتا کھو گیا تو والد ننگے پیر ہو جائیں گے۔ اس کے والد کے لئے ایک اکیلا جوتا ایک جوڑ جوتے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا:

''کوئی بات نہیں کسی نہ کسی طرح جوتے والے کا جواب دے دوں گا۔
میں جاتا ہوں اور بابا کا جوتا لاتا ہوں۔ گم ہونے سے بہتر ہے...لیکن وہ
دوبارہ پوچھے گا پیارے بیٹے اس ایک تنہا جوتے کو کہاں ڈال دیا؟''

حسین کے لئے جواب دینا مشکل تھا۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ کوئی اسے کاہل سمجھے۔ اس نے زیر لب تین بار صلوات پڑھی اور خدا سے مدد مانگی۔ دل کو سکون ملا۔ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک نئی ترکیب سمجھ میں آ گئی۔

اپنے جوتے کفشدار کو دے دیتا ہوں اور بابا کا جوتا جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ پینٹ کی جیب زیادہ چھوٹی نہ تھی۔ اس طرح وہ اپنے ہاتھوں کا بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے جوتے آرام سے میز پر رکھے۔

''جناب...ان کو''

''صرف یہی ایک جوڑ ہیں''۔

''ہاں''۔

پھر زمین پر پڑے بابا کے جوتے پر نظر کی اور اسے مخاطب کر کے کہا:

''یعنی تو نہیں، صرف میرے جوتے''۔

کفشدار سے ٹوکن لے کر بابا کے جوتے کو اٹھایا اور اس کو اپنے پیچھے چھپایا تا کہ کفشدار کی نظر سے بچا جا سکے۔ پھر گیلری کے آخر میں پہنچ کر کوشش کی کہ جوتے کو

جیب میں چھپائے لیکن نہیں چھپ سکا۔ پھر اس کو آگے کی طرف سے پینٹ کی جیب میں رکھا تو کپڑے پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ یعنی جیب پھٹ چکی تھی۔ لیکن بالکل بھی پریشانی کا احساس نہیں ہوا۔ بابا حرم میں منتظر ہیں اور حسین اسی فکر میں تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے خود کو وہاں تک پہنچائے۔

حرم میں داخل ہوا۔ شرٹ کو پینٹ کے اوپر کیا اور ہاتھ جیب کے اوپر رکھا کیونکہ جیب موٹی ہوگئی تھی اور یہ ڈر تھا کہ کہیں بابا کو معلوم نہ ہو جائے۔

باپ دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے حسین کے آنے کا انتظار کر رہے تھے تا کہ ایک ساتھ حرم میں داخل ہوں۔ زیارت پڑھتے وقت حسین کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ ہر جملے کے بعد بابا کے ایک پیر کے جوتے کے لئے کوئی راہ حل نکالتا تھا۔ ایک بار اس نے بلند آواز سے کہا:

''بہت اچھا ہوا!''

بابا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا:

''کیا اچھا ہوا حسین''۔

حسین نے مسکرا کر کہا:

''کچھ نہیں باقی زیارت پڑھتے ہیں''۔

بہترین راہ حل یہ ہے کہ گھر سے بابا کے سیدھے پیر کے جوتے کو بھی لے آؤں اور چپکے سے گاڑی میں رکھ دوں۔ پھر دو جوڑ جوتے کفشدار کے حوالے کروں۔ اب سوال کر کے مجھے الجھاؤ..اب بابا کے دو پیر ہو جائیں گے۔ پہلے کی طرح جب وہ مصنوعی پیر پہنتے تھے۔

وہ خوش تھا۔ اگر اس منصوبے پر عمل درآمد کرتا تو اسے سکون مل جاتا۔ یہ منصوبہ اسے کفشدار اور لوگوں کی حیرت زدہ نگاہوں سے نجات دلاتا۔ اب وہ مجبور نہیں تھا کہ

من من کرے اور کوئی یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ شیطان ہے اور اپنے بابا کے ایک جوتے کو گم کر دیا ہے۔

☆

اب ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ حسین کے ذہن سے وہ منصوبہ نکل چکا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ مصنوعی پیر بھی اپنے ساتھ حرم لانے والا تھا۔ اسی لئے وہ ابھی بھی پریشان تھا۔ لیکن اس میں ایک پریشانی یہ تھی کہ مصنوعی پیر لگانا بابا کے لئے مشکل تھا۔ حسین کو یہ معلوم تھا کہ مصنوعی پیر سے بابا کو کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔

وہ ماضی میں کھو گیا۔ جب وہ لوگ آپس میں کشتی کرتے تھے۔ مصنوعی پیر کے ساتھ بابا کے لئے کشتی کرنا مشکل تھا۔ وہ لوگ جمعہ کے دن تقریباً آدھا گھنٹہ کشتی اور تفریح کرتے تھے۔ حسین بابا کا حریف نہیں تھا۔ بابا بیٹھ کر کشتی لڑتے تھے اور حسین کھڑے ہوکر۔ حسین دو تین بار بابا کو چت کرتا تھا لیکن خود سات آٹھ بار چت ہوجاتا تھا ایک پیر کا حریف بہت قوی تھا۔ کبھی کبھی فاطمہ جو پہلی کلاس میں تھی وہ بھی بھائی کی مدد کے لئے آتی تھی۔ لیکن وہ دونوں مل کر بھی کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ بابا بہت احتیاط برتتے تھے کہ کہیں فاطمہ کو چوٹ نہ لگ جائے۔ لیکن کبھی حسین کا ہاتھ یا پیر فاطمہ کے چہرے پر پڑ جاتا تھا۔

جب خوب اچھی طرح کشتی ہوجاتی، پسینے میں غرق ہوجاتے تو زمین پر لیٹ جاتے۔ ماں ان کے لئے ایک پاک صاف اور چمکتی سینی میں رکھ کر کپوں میں چائے لاتی۔ آہ واہ سردیوں کی اس ٹھنڈی ہوا میں چائے میں بہت مزا آتا اور تھکن دور ہوجاتی۔ اب ایک بار پھر شب جمعہ آئی۔ بابا نے ایک بار پھر حسین کو آواز دی:

"حسین جان! حرم جانے کے لئے تیار ہو؟"

"کب چلیں؟"

''پندرہ منٹ بعد''۔

''آپ اپنا مصنوعی پیر نہیں پہنیں گے؟''

''مصنوعی پیر؟''

حسین خاموش ہوگیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا اگر بابا اپنے مصنوعی پیر کو لگائیں تو پھر کفشدار کو جوتے دیتے وقت کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ پھر میں ایک جوڑا اپنے اور ایک جوڑا بابا کے جوتوں کو کفشدار کے حوالے کردوں گا۔ پھر سر اٹھا کر کفشدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں گا یعنی یہ کہ ہم بھی حرم آتے وقت پورے دو جوڑے جوتے آپ کو دے سکتے ہیں۔یعنی چار جوتے الگ الگ۔

حسین نے یہی سوچتے ہوئے کہا:

''بابا آپ مصنوعی پیر نہیں لگائیں گے۔ پیر لگانے سے تو آسانی ہوجاتی ہے۔

باپ نے کہا:

''نہیں میرے بیٹا! کچھ دنوں سے پیر میں زخم ہوگیا ہے کیونکہ آفس جاتے وقت ان کو پہنتا ہوں۔ اچھا ہے کہ جمعرات اور جمعہ کو نہ پہنوں ورنہ میرا پیر خراب ہوجائیگا''۔

حسین فکر میں ڈوب گیا۔ اس کا دل پریشان تھا۔ باپ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

''یعنی حسین تم ان دو دن بھی اجازت نہیں دو گے کہ اس مصنوعی پیر کے شر سے امان میں رہوں''۔

بابا کا نقلی پیر پلائی اور پلاسٹیک کا بنا ہوا تھا اور اس کا درمیانی حصہ فلز کا تھا اور دوسرے نقلی پیروں سے ہلکا تھا۔لیکن حسین کو معلوم تھا کہ نقلی پیر زانو کے اوپر سے بنتے ہیں

بھاری ہوتے ہیں اور جاں بازوں کو مشکل و پریشانی میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نقلی پیر جو زانو کے اوپر سے ہوتا ہے اس میں ڈبی کی طرح دو حصے ہوتے ہیں اور کٹی ہوئی ران اس میں ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح کی چیزیں اس نے آہستہ آہستہ سیکھ لی تھی۔ ماں روزانہ ایک نرم اور صاف کپڑے سے نقلی پیر کے اندر صفائی کرتی تھیں تا کہ پیر میں سڑن نہ ہوجائے۔ گرمی کے زمانے میں زیادہ احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ حسین جانتا تھا کہ نقلی پاؤں کے اندر سے ہوا نکالنے کے لئے اس کے اوپر ایک بٹن ہے اور اس طرح سے وہ نقلی پیر بابا کی ران پر چپک جاتا۔ اس بٹن کا نام والف تھا اور پیر کے اندر کی ہوا کو کنٹرول کرنے کے کام آتا ہے۔

پھر اس نے بابا سے کہا:

''جس طرح آپ آرام و سکون محسوس کریں وہی بہتر ہے۔ نقلی پیر کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو ہوں!''

باپ نے کہا:

''پھر جلدی تیار ہوجاؤ''۔

حسین پھر غمگین ہوگیا۔ اب داستان پھر سے شروع ہوگی۔ وہ بھیڑ بھاڑ والی گیلری وہ کفشدار اور ایک تنہا جوتا اے خدا کیا کروں!

وہ یہ بھول گیا تھا کہ گذشتہ ہفتے اس نے کون سا منصوبہ ذہن میں تیار کیا تھا تا کہ باپ کے جوتے بھی ایک جوڑ ہوجائیں۔ نہ کہ ایک تنہا جوتا۔ اب دوبارہ سے کفشداری اور دیگر لوگوں کی نظروں کا شکار بنوں گا۔

''اے بیٹا ایک جوتا کہیں کھودیا ہے؟''

وہ لوگ سوچتے ہیں میں بچہ ہوں اور ایک جوڑ جوتوں کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ میں دس سال کا ہوں۔ دس سال والے کو بچہ نہیں کہا جاتا۔ تین کلاس پاس کرچکا ہوں اور

کبھی فیل نہیں ہوا اور کچھ مہینے سے چوتھے کلاس میں ہوں اور اس میں بھی میری کارکردگی اچھی ہے۔ کہاں میں شیطان بچوں کی طرح ہوا؟ افسوس کہ میں آسانی سے نہیں بتا سکتا کہ ماجرا کیا ہے۔ اگر میں ان سے یہ کہوں کہ میرے باپ کا ایک پیر ہے تو کیا یہ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے؟ ان ناآشنا بچوں کی طرح جو پریشان کرتے ہیں:

''اے میرے خدا کب تک میں ان بچوں کے آزار و اذیت کا شکار بنتا رہوں گا''۔

جب بھی وہ لوگ مجھ کو اور بابا کو سڑک پر دیکھتے ہیں تو پلٹ کر ہمیں اپنے ماں باپ کو دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اماں ان کا پیر کس نے کاٹ دیا؟''

حسین اس طرح کے سوالوں سے پریشان تھا۔ وہ بچے جو نہیں جانتے تھے کہ رحمت صاحب اس کے باپ ہیں اور پوچھتے تھے:

''ان کا پیر ٹوٹ گیا ہے؟''

وہ لوگوں کی بے تکی باتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ وہ چلانا چاہتا تھا، وہ بھاگ جانا چاہتا تھا، وہ ان سب سے لڑنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا اپنا ہاتھ ان کے منہ پر رکھ کر ان کو بولنے سے روکے۔ ابھی تک اس نے کسی ناآشنا بچے کو نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے باپ ہیں۔ یہاں تک کہ جب کبھی اس کے والد اس کی پڑھائی کے سلسلے میں معلومات کے واسطے اسکول آتے تھے تو وہ بھاگ کر ٹوئیلٹ میں چھپ جاتا اور دروازہ اندر سے بند کر لیتا۔ اسکول کے لاؤڈ سپیکر سے آواز آتی:

''حسین تقوائی۔ حسین تقوائی کلاس چار اسکول کے آفس میں حاضر ہوں''۔

لیکن وہ بالکل نہیں سنتا تھا اور اس وقت تک ٹوئیلٹ میں رہتا تھا جب تک کہ اس کے والد کی میٹنگ اسکول کے پرنسپل سے ختم نہ ہو جاتی اور وہ چلے نہ جاتے۔

حسین نے یہ راز کسی سے نہیں بتایا تھا۔صرف ایک سجاد تھا جو اس کے راز دل سے واقف تھا۔سجاد مدنی جو اس سے ایک سال چھوٹا تھا اور تیسرے کلاس میں پڑھتا تھا۔اس کے والد کی بھی میدان جنگ میں ایک ٹانگ اور ایک آنکھ ختم ہوگئی تھی۔ان کی ہم دلی اور دوستی کی یہی وجہ تھی۔کبھی کبھی ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔ گھر بھی دونوں کا برابر کی گلی میں تھا۔سجاد اس سے چھوٹا ہونے کے باوجود شرم نہیں کرتا تھا۔وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہمارے اور تمہارے والد نے خدا سے سودا کیا ہے۔

لیکن حسین بہت پہلے سجاد سے کہہ چکا تھا کہ جب بھی میرے والد اسکول میں آتے ہیں تو میں ٹویلیٹ میں چھپ جاتا ہوں۔لیکن سجاد اس سے کہتا تھا کہ تم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ وہ کہتا تھا کہ اگر بچوں کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ جنگ میں زخمی ہوئے ہیں اور ان کی ٹانگ کٹ گئی ہے تو ہمارا احترام کریں گے۔لیکن حسین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔سجاد بھی ایک دن اپنے باپ کا ایک عصا اسکول لیکر آیا اور سب سے کہا کہ میرے باپ جانباز ہیں اس کے بعد سے کبھی کبھی بچے ان کی احوال پرسی کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ سجاد اپنے والد کے بارے میں بتائے کبھی کبھی مذاق کرتے اور اس کے بابا کے عصا کا حال معلوم کرتے اور کہتے:

"اپنے بابا اور ان کے عصا کو ہمارا سلام عرض کرنا"۔

سجاد اس طرح کے مذاق سے بالکل پریشان نہیں ہوتا تھا وہ ہنستا تھا اور خود بھی بچوں کے ساتھ تفریح کرتا۔لیکن حسین کا مزاج دوسرا تھا۔وہ نظروں سے ڈرتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی اس کے والد کے ایک پیر کے بارے میں سوچتا بھی تو وہ ڈر جاتا تھا۔ انسان کی عزت ختم ہوجاتی ہے۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ کہتا۔کوئی کہتا وائے وائے! کوئی افسوس کرتا اور کوئی ترس کھاتا۔کوئی ان کی طرف اشارہ کرکے اپنے دوست سے کہتا

ان کو دیکھئے کیسے ہو گئے۔ایک پیر نہیں ہے۔پہلی کلاس کے بچے تو بابا کو دیکھتے ہی ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بابا اپنے عصا سے ان کو مارنا چاہتے ہیں۔ حسین انہیں خیالوں میں گم تھا کہ ایک بار پھر باپ نے آواز دی:

''حسین جان! تیار ہوئے یا نہیں؟''

یاد آیا کہ زیارت کے لئے جانا ہے:

''ہاں بابا! بالکل ابھی''

''پارکنگ کا گیٹ کھولو تا کہ گاڑی نکالیں''۔

حسین خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔اس نے کہا:

''گاڑی لاؤں''۔

باپ نے کہا:

''نہیں بیٹا تو صرف پارکنگ کا دروازہ کھول''۔

حسین نے تھوڑے شیریں انداز میں بابا کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''اجازت دیجئے کہ میں گاڑی اسٹارٹ کروں''۔

باپ نے ہنستے ہوئے کہا:

''کوئی بات نہیں۔اسٹارٹ سے پہلے دو تین بار ایکسی لیٹر دباؤ تا کہ تیل کاربورڈ میں آ جائے پھر گاڑی اسٹارت کرنا''۔

حسین نے چابی لیکر خوشی کا اظہار کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ کچھ سکنڈوں بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز کمرے میں گونج گئی۔ یہ ٹویٹا ۷۵ ماڈل تھی جو چار سال پہلے خریدی گئی تھی لیکن بیس سال سے زیادہ اس کی عمر گزر چکی تھی اور کبھی کبھی بہت پریشان کرتی۔بابا کہتے تھے اس گاڑی کو نئی گاڑی سے بدلنے میں زیادہ روپیوں کی ضرورت ہے۔

سب گھر والے اس ٹوٹیا کی کچھ چیزوں کو خود ہی ٹھیک کرلیا کرتے تھے یہاں تک کہ ماں بھی پلاس اور پیچ کس وغیرہ سے خود چھوٹی موٹی کمی کو ٹھیک کر لیتی تھیں۔

اگر چہ حسین ابھی گیارہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس کا لقب حسین آ قا ڈرائیور دینا غیر مناسب نہیں تھا وہ اس لقب سے خوش ہوتا تھا اور سننے کے بعد پھولے نہیں سماتا تھا۔ وہ دوسرے کلاس ہی سے ڈرائیور کا شاگرد اور بابا کا ہاتھ تھا۔ اس نے کافی ترقی کی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنا، تیل اور پانی کا چیک کرنا، شیشے صاف کرنا، آگے پیچھے لائٹوں کو چیک کرنا اور کبھی کبھی والد کے گاڑی چلاتے میں اسٹیرنگ پکڑنا اور بقول اس کے ڈرائیونگ کرتا تھا اور کبھی کبھی اس کے والد ایکسی لیٹر اس کو دے دیتے تھے اور وہی ایکسی لیٹر دباتا تھا۔

باپ کو بھی یہ بات ناپسند نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آہستہ آہستہ اس کو ڈرائیونگ سکھادیں اور کبھی کبھی تو پوری طرح سے گاڑی اسی کے حوالے کر دیتے تھے تا کہ گلی سے گھر تک لے آئے اور کبھی کسی اچھے کام پر اس کو انعام دینے کا وعدہ ہوتا تھا تو وہ پسند کرتا تھا کہ اس کو ڈرائیونگ کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ کبھی پوری طرح سے راضی نہیں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اسٹیرنگ پکڑنا یا ایکسیلیٹر دبانا یا تھوڑی سی ڈرائیونگ اس کے لئے بہت کم ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک پروفیشنل ڈرائیور سمجھتا تھا۔ اس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ جب کوئی اہم ضروری کام پیش آتا تو وہ کہتا:

''بابا! آپ رہنے دیجئے میں گاڑی سے جاتا ہوں اور جلدی سے واپس آتا ہوں''۔

وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بابا کبھی اس کو اجازت نہیں دیں گے ہمیشہ اصرار کرتا رہتا۔ اس کے لئے اتنا کافی تھا کہ ایک بار اجازت مل جائے۔ پھر وہ بڑوں کی طرح روڈ پر بڑے اطمینان سے ڈرائیونگ کرے۔ کاش ایک بار اجازت مل جاتی!

اس کا دل ڈرائیونگ کے لئے پریشان ہے۔کبھی وہ خواب میں دیکھتا کہ گاڑی چلا رہا ہے اور گھر کے لئے خریداری کر رہا ہے۔لیکن وہ اپنے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بابا سے ہر وقت یہ بات نہیں کہی جاسکتی ہے۔وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ جس وقت بابا کو جلدی ہو اس وقت ڈرائیونگ کرنے کے لئے کہنا مناسب نہیں ہے۔ اسے معلوم تھا کہ بابا کے خوش ہونے پر اجازت مل سکتی ہے۔ ورنہ درخواست کو خاموش رہ کر رد کیا جاسکتا ہے۔ بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں یا شہر کے باہر ہائی وے پر بھی ان سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی تھی لیکن کبھی کبھی اس سے برداشت نہیں ہوتا اور بے ساختہ ان سے کہتا:

''بابا اب برداشت سے باہر ہے''۔

بابا پوچھتے ہیں:

''کیوں؟''

حسین کہتا:

''کب سے یہاں بیٹھا ہوں اور اسٹیرنگ کو ہاتھ تک نہیں لگایا''۔

وہ اچھی طرح واقف ہوگیا تھا صرف کچھ منٹوں کا وقت لگتا تھا۔ پہلے وہ اچھی اچھی باتوں سے بابا کو خوش کرتا۔ اس کے بعد کا مرحلہ آسان تھا۔ آہستہ آہستہ اسٹیرنگ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور بابا صرف ایکسی لیٹر بریک اور گیر اپنے ہاتھ میں رکھتے۔

اب اس بار بابا نے چابی بھی دے دی تھی تا کہ حسین گاڑی کو اسٹارٹ کرے۔ اس بات سے پتہ چلتا تھا کہ بابا خوش ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے اصرار پر ڈرائیونگ بھی کرا سکتے ہیں۔

بابا نے بیساکھیوں کے سہارے گاڑی تک پہنچ کر دروازہ کھولا تا کہ گاڑی میں سوار ہوں اور بیساکھیوں کو سیٹ پر رکھا۔حسین کو اس منصوبے کی یاد آئی اور اس کے

پاس اتنا وقت تھا کہ اس پر عمل کر سکے۔ گھر میں رکھے ہوئے بابا کے ایک جوتے کو اٹھایا اس کو نیچے سے ایک کپڑے سے صاف کر کے پینٹ کی جیب میں رکھنے کی کوشش کی۔ شرٹ کو پینٹ کے اوپر کیا تا کہ آدھا جوتا جو باہر رہ گیا تھا دکھائی نہ دے۔

آخر کار براؤن رنگ کی ٹویٹا میں سوار ہوکر چلے۔ راستے میں بابا نے کئی بار اسٹیرنگ اس کے ہاتھ میں دیا۔ جس وقت حرم پہنچے حسین بہت زیادہ خوش تھا اور اس کے پیر زمین پر نہیں تھے۔ ابھی وہ اسی دنیا میں سیر کر رہا تھا کہ بابا نے گاڑی کو حرم کے پاس بنی پارکنگ میں کھڑی کی۔ سامنے بورڈ پر لکھا ہوا تھا:

جانبازان کی گاڑیوں کے لئے مخصوص اور اس پر ویلچیئر پر بیٹھے ہوئے آدمی کی تصویر بنی تھی۔ بابا گاڑی سے اترے۔ معمول کے مطابق تالا لگانا اور اسٹیرنگ کو زنجیر سے باندھنا حسین کا کام تھا۔ وہ ڈرائیور کی سیٹ کی طرف گیا تا کہ اس کے نیچے سے زنجیر نکالے اور اس کو اسٹیرنگ میں باندھ کر تالا لگائے۔ جب وہ جھکا تو بابا کے جوتے پر نظر پڑی کہ جو جیب سے باہر نکلا ہوا تھا۔ زنجیر اسٹیرنگ میں باندھی اور تالا لگایا پھر ایک بار اس کو کھینچ کر دیکھا تا کہ مطمئن ہوجائے کہ صحیح بندھ گئی ہے۔ پھر گاڑی کا دروازہ لاک کر کے دوڑکر خود کو بابا کے پاس پہنچایا۔ بابا دو المونیم کی بیساکھی کے سہارے چل رہے تھے۔ ایک ساتھ صحن کی طرف گئے۔ جوتے رکھنے والے کے نزدیک حسین نے کہا:

''بابا جان! بہت اچھا لگا''۔

باپ نے پوچھا:

''کیا بیٹا؟''

''ڈرائیونگ''۔

''واپسی میں بھی میں ہی ڈرائیونگ کروں گا''۔

باپ نے ہنستے ہوئے کہا:

''اپنی حد میں رہو''۔

حسین نے کہا:

''بابا میں اپنی حدود میں ہوں''۔

جب باپ نے یہ دیکھا کہ یہ بحث سنجیدہ ہوتی جارہی ہے تو کہا:

''اول یہ کہ ابھی تمہارے پاس ڈرائیونگ سیکھنے کا کافی وقت ہے۔ دوسرے یہ کہ گاڑی آٹومیٹیک ہے تم کو عام گاڑیوں سے ڈرائیونگ سیکھنی چاہئے۔ یہ گاڑی مجھ جیسے لوگوں کے لئے ہے جو کلچ نہیں دبا سکتے ہیں''۔

حسین نے کہا:

''بابا! خدا کی قسم ڈرائیونگ مجھے بہت پسند ہے''۔

کفشدار کے پاس پہنچ کر باپ نے اپنا جوتا اتارا اور حسین کے حوالے کر کے کہا:

''میں اس دروازے سے حرم میں جارہا ہوں۔ ادھر بھیڑ کم ہے اور تم جوتے کفشدار کو دے کر جلدی آؤ''۔

''حکم سر آنکھوں پر''

ابھی وہ ڈرائیونگ کی یاد میں کھویا ہوا تھا اور اسٹیرنگ کو ہاتھ میں لیکر گھما کر موڑنے کا احساس کررہا تھا۔ وہ جیب میں رکھے جوتے کو بھول گیا تھا۔ کفشدار کے پاس جوتے دینے پہنچا تو تین جوتے اس کی میز پر رکھے۔ کفشدار نے کہا:

''یہ کیا ہے؟ ایک اور جوتا کہاں ہے؟''

حسین حیران تھا کہ کیا جواب دے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دنیا گھومنے لگی ہو۔

''بس یہی ہیں''

کفشدار نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے غصے میں کہا:

''بچے تم کتنے شیطان ہو! یقیناً تمہارے بیچارے باپ کا جوتا ہے دیکھو دوسرا جوتا کہاں پھینک دیا''۔

وہ شرم سے پیلا پڑ گیا۔لعاب دہن خشک ہوگیا۔اس میں جواب دینے کی سکت ہی کہاں تھی۔ایک شخص آیا جھکا اپنے جوتے پیروں سے اتارے اور میز پر رکھ دئے۔ اس شخص کے جوتے دیکھنے کے بعد حسین کو اپنا بنایا ہوا منصوبہ یاد آیا۔اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب جوتوں کے دو مکمل جوڑے دے سکتا تھا۔ وہ اپنی تمام پریشانیوں کو بھول چکا تھا۔وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔وہ خوشی سے اڑنا چاہتا تھا۔اسے فخر محسوس ہورہا تھا۔

''کیا؟ وہ اکلوتا بابا کا جوتا ؟... ہاں ہاں ابھی دیتا ہوں''۔

اس نے اپنا ہاتھ پینٹ کی سیدھی جیب میں ڈالا لیکن جوتا اس میں نہیں تھا۔ بجائے اس کے کہ خود خوشی سے پرواز کرتا جوتا پرواز کر چکا تھا۔

وہ پریشان ہوا۔اسے خوف محسوس ہوا۔اس کا دل عجیب پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ اس کی خوشی برف کے ایک چھوٹے ٹکڑے کے مانند جلدی ہی پانی میں تبدیل ہوگئی۔ اور اس کی جگہ غصہ اور پریشانی نے لے لی۔لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک چھوٹی سی خوشی کی لہر ڈرائیونگ کی وجہ سے تھی۔

اس نے خود سے کہا:

''جوتا کیا ہوا؟ شاید لانا بھول گیا؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے یاد آیا کہ جوتے کو جیب میں رکھا تھا اور گاڑی لاک کرتے وقت اسے دیکھا تھا۔پینٹ کی بائیں جیب بھی دیکھ لی لیکن جوتا نہیں تھا۔بابا کا جوتا کوئی چھوٹی سی چیز تو نہیں کہ جیب میں رہ جائے اور دکھائی نہ دے۔شروع ہی سے آدھا جوتا جیب سے باہر تھا اور جیب بھی بھاری ہوگئی تھی۔

''اے خدا کیا کروں!''

گلے میں آواز رندھ گئی۔ آنکھیں ایسی ہوگئیں جیسے کوئی چیز آنکھ میں پڑ گئی ہو۔ آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ منھ کو صاف کیا۔ کیسی مشکل بابا کے اس ایک جوتے پر آن پڑی۔ اس نے خود سے کہا: اگر بابا سنیچر کو اپنے نقلی پیر سے آفس جائیں گے تو میں کیا کروں گا۔ کیا جواب دوں گا؟

ابھی تک تو ایک مشکل تھی اب مشکلیں دوگنی ہوگئیں۔ اب بابا کو کیا جواب دے گا۔ آس پاس نظر دوڑائی شاید وہ جوتا مل جائے لیکن جوتا نہیں ملا۔

''حسین۔ حسین کہاں ہو بابا!''

یہ باپ کی آواز تھی جو صحن کہ دروازے کے قریب کھڑے تھے اور حسین کو بلا رہے تھے۔

''حسین تم کیوں نہیں آتے؟''

پریشانی کی حالت میں آہستہ آہستہ تین جوتوں کو بغل میں دبائے باپ کے قریب گیا۔ آنسو رخساروں سے ڈھلکر نیچے گر رہے تھے۔ نظریں بابا پر پڑیں آواز گلوگیر ہوگئی اور دوبارہ آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ باپ نے پریشان ہوکر پوچھا:

''کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟ کیوں تم نے جوتے نہیں دیے؟''

کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ کس طرح بابا سے کہتا کہ وہ خود اپنی مرضی سے وہ نقلی جوتا گھر سے لایا تھا اور اس کو گم کردیا۔ خاموش تھا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ آنسوں کا راستہ بدلا اور منہ کی طرف گیا۔ نمکین مزے کا احساس ہوا ناک کے پانی کو ایک دوبار اوپر کی طرف کھینچا اور کہا:

''میں...میں''

باپ نے پوچھا:

''کیا ہوا بیٹا ؟ کیوں میرے بیٹے ؟''

''میں چاہتا تھا...''

''ٹھیک ؟''

''میں آپ کے ایک جوتے کے بجائے دو جوتے یعنی ایک جفت کنشدار کو دینا چاہتا تھا۔ میں آپ کے سیدھے پیر کے جوتے کو بھی یہاں لایا تھا''۔

اسے احساس ہورہا تھا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ہق ہق کرنا شروع کیا اور ہاتھ کی پشت سے آنسوں کو صاف کیا۔

''جوتا آپ کا جوتا گھر سے لایا تھا لیکن نہیں معلوم کہاں گر گیا''۔

بابا ابھی تک اس کی بات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے۔

''نہیں بیٹا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں نقلی پیر پہن کر نہیں آیا ہوں''۔

حسین نے دوبارہ کہا میں آپ کے جوتے کو گھر سے لایا تھا لیکن کہیں کھو گیا۔

''کیا؟تم اس دوسرے جوتے کو اپنے ساتھ لائے تھے؟''

حسین نے سر ہلایا۔

بابا نے صحن کی طرف نگاہ کی اور کہا:

''میں نہیں سمجھ پا رہا تم نے اس کو کہاں چھوڑا؟''

حسین نے کہا:

''میں ان کنشداروں سے عاجز آ گیا ہوں ہمیشہ یہ سوال کرتے ہیں کہ وہ دوسرا جوتا کہاں ہے''۔

ناک کے پانی کو اوپر کیا اور آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ ابھی آنکھوں میں آنسوں بھرے ہوئے تھے۔

''یعنی تم دوسرے جوتے کو لائے تھے تا کہ اس کو اس کے ساتھ کنفشدار کو دو؟''

''ہاں''

باپ نے کہا:

''یہ اس طرح کی بڑی سوچ کس سے سیکھی؟''

''خود سے''۔

''کس بین الاقوامی دماغ سے مشورہ کیا کہ اس سنہری فکر تک رسائی ہوئی''۔

''اپنے آپ سے''۔

''اب تمہیں معلوم ہے وہ دوسرا جوتا کہاں پھینک دیا؟''

''نہیں''

''ٹھیک ہے تم ان جوتوں کو زمین پر رکھ دو۔ ہم دوسرے جوتے کو تلاش کرتے ہیں''۔

انہوں نے جوتا پہنا اور پارک کی طرف چل پڑے۔ ان کی آنکھیں اس جوتے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں۔ گاڑی کے نزدیک پہنچ گئے تھے لیکن کہیں اس جوتے کا پتہ نہیں تھا۔ لیکن نہیں۔ حسین کی نظریں ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ کیا دیکھا وہ جوتا گاڑی کے نیچے ڈرائیور کی سائڈ میں تھا۔ سکون کی سانس لی۔ خوشی کے آنسو چہرے پر ڈھلکے۔ دوبارہ اس نمکین مزے کو چکھنے کا احساس کیا۔

باپ نے کہا:

''مسٹر پروفیسر! جس وقت اسٹیرنگ اور گاڑی کو قفل کرنے کے لئے جھکے تھے تو یہ اسی وقت گر گیا ہوگا''۔

اپنے سر کو نیچے کیا۔ اچانک بابا کے ہونٹوں کی گرمی کو اپنی پیشانی پر احساس کیا۔ کوئی چیز شمع کی طرح دل میں روشن ہوئی۔ اپنے چہرے کو آستین سے صاف کیا۔

'ضروری نہیں ہے کہ میرے جوتے اپنے ہمراہ حرم لاؤ۔ حرم میں آج بھیڑ کم ہے۔ میں خود آتا ہوں اور اپنے جوتے کفشدار کو دیتا ہوں''۔

حسین نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بابا کے اس جوتے کو گاڑی میں رکھ کر لاک کر دیا۔ بابا عصا کے سہارے چلے اور کفشدار کی میز کے نزدیک پہنچے۔ اس نے بہت ہی حیرت سے دیکھا کہ کفشداروں نے بابا کو بہت احترام کے ساتھ سلام کیا اور احوال پرسی کی۔ ایک کفشدار نے اس طرح سے بڑھ کر بابا کے جوتے کو لیا جیسے وہ ایک نہیں دو ہیں بلکہ بہت قیمتی شئے ہیں۔

یہ کیسی بے انصافی ہے۔ یہ وہی جوتا تو ہے کہ جس کی خاطر ہر ہفتے مجھے پریشان کیا کرتے تھے۔ اب دیکھئے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ کتنا احترام کر رہے ہیں۔ کفشداروں نے التماس دعا کرتے ہوئے احترام کے ساتھ ٹوکن دیا۔ حرم میں داخل ہوئے اور زیارت پڑھنی شروع کی حسین دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہا ہے:

آخر میں کس طرح ان کو سمجھاؤں کہ یہ وہی جوتا ہے؟ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کیوں کیا لیکن بابا سے کچھ نہیں کہا؟ شاید عصا سے سمجھ گئے کہ ان کا ایک پیر ہے اگر میں بھی دو عصا ہاتھ میں لے لوں میرا بھی احترام کریں گے اور آرام سے اکیلے جوتے کو لیں گے۔ پھر وہ مجھے سے بھی التماس دعا کریں گے۔ کتنا اچھا لگے گا۔ میں بھی کہوں گا: بہت اچھا! شکریہ دعا کا طالب!

اس نے آرزو کی کہ کاش ایک بار سہی دو عصا کے ساتھ حرم جاؤں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے۔

☆

ایک ہفتہ گزرا۔ یہ ہفتہ حسین کے لئے اسکول میں پڑھنے کا تھا اور رحمت صاحب کے لئے اسکول میں پڑھانے کا۔

حالانکہ وہ دوپہر کے بعد سنیچر سے بدھ تک پبلک لائبریری میں بھی لائبریرین کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ پبلک لائبریری نمبر دو ایک بڑی لائبریری تھی اور وہاں کافی تعداد میں لوگ آتے اور مطالعہ کرتے۔ رحمت صاحب جمعرات کے دن کو زیادہ تر خرید اری اور ادھورے کاموں کو پورا کرنے میں صرف کرتے تھے۔ جمعرات کو جب وہ ڈرائیونگ کے لئے گاڑی میں بیٹھتے تو نقلی پیر نہیں پہنتے تھے۔ کہتے تھے بلا نقلی پیر کے ڈرائیونگ آسان ہے۔ نقلی پیر ہاتھ اور پاؤں کو باندھ دیتا ہے اور اس کے برداشت کرنے لئے حوصلے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر پیدل لمبا راستہ طے کرنا ہے تو اس وقت نقلی پیر کی ضرورت ہے ورنہ انسان بری طرح مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ شب جمعہ رحمت صاحب بنا نقلی پیر کے زیارت کے لئے جاتے تھے۔ جانبازوں کی مخصوص پارکنگ حرم سے نزدیک تھی اس لئے انہیں زیادہ پیدل نہیں چلنا پڑتا تھا۔

اب دوبارہ شب جمعہ آئی۔ رحمت صاحب حرم جانا چاہتے تھے لیکن تھکن کا احساس ہو رہا تھا ہفتے کے پانچ دن صبح سے شام تک آفس میں کام اور وہ بھی نقلی پیر کی ساتھ۔ نام سنتے ہی بدن میں درد ہونے لگتا ہے تو پہننے کے بعد کیا ہوگا۔

سنیچر سے بدھ تک نقلی پیر پہن کر تختہ سیاہ کے پاس کھڑے ہو کر ریاضی پڑھانا۔ اور یہ درس بنا نقلی پیر کے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ خود کہتے تھے کہ بنا نقلی پیر کے میں نہیں پڑھا سکتا کیونکہ ریاضی پڑھانے کے لئے مسلسل تختہ سیاہ کے پاس کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کتابخانہ میں کام کرنے میں بھی یہی حال ہوتا تھا بنا نقلی پاؤں کے کتابوں کی الماریوں کے درمیان چلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے اگر کتابخانہ میں کتابوں کو درست کرنا ہے تو

نقلی جوتا پہننا ضروری ہے اور اگر عصا کے ذریعے کتابخانے میں چلوں تو کتابوں کو اس طرف سے اس طرف منتقل کرنے میں دشواری ہوگی۔

جب حسین کی ماں نے دیکھا کہ رحمت صاحب کچھ سوچ رہے ہیں تو کہا:

''آج ہمارے گھر کوئی مہمان نہیں ہے۔آج ہم ایک ساتھ حرم چلتے ہیں''

رحمت صاحب ابھی نقلی پیر کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ حسین کی ماں نے پوچھا:

''چلنا ہے یا نہیں؟''

رحمت صاحب نے کہا:

''ایک شرط کے ساتھ!''

حسین کی ماں نے کہا:

''کون سی شرط؟''

''اس شرط پر کہ واپسی میں تھوڑی دیر کے لئے مدنی صاحب کی طرف چلیں گے اور ان کی اور ان کے بچوں کی احوال پرسی کریں گے''۔

''کیا کچھ ہوگیا ہے؟''

رحمت صاحب نے غمگین ہو کر جواب دیا:

''حسین کہہ رہا تھا کہ دو تین دن سے سجاد اسکول نہیں آرہا ہے اور مریض ہے۔سجاد کی بھی خیریت مل جائیگی اور مدنی صاحب کی بھی احوال پرسی ہوجائیگی''۔

حسین کی ماں نے کہا:

''ٹھیک ہے لیکن جانے سے پہلے ایک فون ان کو کرلو۔دیکھیں کہ وہ گھر پر ہیں یا نہیں''۔

رحمت صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ ماں نے ان کے گھر کا نمبر ملایا۔

''مریم خانم سلام''

''سلام خانم تقوائی۔ کیا خوب''۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آج کچھ دیر کے لئے آپ کے مہمان ہوں''۔

''بہت خوشی ہوگی۔ آپ کے قدم ہماری پلکوں پر۔ ضرور تشریف لائیے''۔

''اگر ابھی آجائیں تو کوئی مشکل تو نہیں ہے...''

''کوئی مشکل نہیں۔ اتفاق سے دو تین دن سے سجاد بیمار ہے اور گھر پر ہی پڑا ہے اگر وہ حسین کو دیکھے گا تو خوش ہوجائے گا۔ مدنی صاحب بھی گر پڑے اور ان کا پیر زخمی ہوگیا ہے''۔

''اچھا پھر ہم ضرور آرہے ہیں''۔

جب ماں نے رحمت صاحب کو پوری بات بتائی کہ مدنی صاحب بھی زخمی ہوگئے ہیں تو رحمت صاحب نے کہا کہ چلو پہلے ان کے گھر چلیں تا کہ اگر ان کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو خرید کر ان کو دے دی جائے۔

پہلے ننھی فاطمہ اور اس کی ماں ان کے گھر کے دروازے پر پہنچے۔ حسین اور ان کے بابا دونوں گاڑی کو مقفل کر کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئے۔ کمرے میں دو بستر لگے ہوئے تھے۔ باپ بیٹے دونوں ایک دوسرے کے برابر میں آرام کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر نے کہا تھا کہ سجاد کی بیماری خشک ہوا کی وجہ سے ہے اگر بارش آجائیگی تو ہوا میں رطوبت آجائیگی اور یہ بیماری کم ہوجائیگی''۔

مدنی صاحب کمبل پر پیر دراز کئے ہوئے بیٹھے تھے اور پشت پر تکیہ لگائے تھے۔

''مدنی صاحب کس مشکل میں گرفتار ہوگئے۔ ایسا تو نہیں کہ سوچ رہے ہوں کہ یہاں بھی میدان جنگ ہے''۔

''نہیں بابا ! بے توجہی کی وجہ سے ایسا ہوگیا۔ پرسوں جب آفس سے واپس آ رہا تھا تو میں چاہتا تھا کہ بائیں پیر کو سیڑھیوں پر رکھوں۔ پیر تو تھا ہی نہیں یہ پیر تو ران کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ میں نے ایک تندرست اور توانا پیر کے طور پر سیڑھی پر رکھا اور گر پڑا۔ خدا نے رحم کیا ورنہ سر زمین پر لگتا تو کیا ہوتا۔ سیدھے پیر کا زانو سیڑھی پر لگا جس سے سیدھے پیر میں چوٹ آئی۔ اب کافی ٹھیک ہو چکا ہوں اور آہستہ آہستہ چلنے لگا ہوں''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''کم از کم تین دن اور آرام کرو''۔

مدنی صاحب نے کہا:

''جب تک میں رہوں میرے ہوش و حواس کٹے ہوئے پاؤں کی طرف ہونا چاہئے''۔

حسین اپنے باپ کے سلسلے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بھی اسی طرح اپنے کٹے پیر کے بارے میں بات کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی احساس کرتا ہوں کہ میرے دونوں پیر اپنی جگہ ہیں یعنی میرے پیر سالم ہیں۔ اس طرح قدم اٹھاتا ہوں کہ یعنی جس طرح دوسرے پیر کو زمین پر رکھتا ہوں اس پیر کو بھی زمین پر رکھوں، لیکن اچانک مجھے یاد آجاتا ہے کہ نقلی پیر کو ذہن میں رکھ کر قدم اٹھاؤں۔

اس رات بابا نے مدنی صاحب سے کہا:

''وہ لوگ کہ جن کا کوئی عضو بدن جنگ میں شہید ہوگیا ہے وہ کبھی کبھی فکر کرتے ہیں کہ وہ اعضا ان کا موجود ہے کیونکہ جسم کو ان اعضا کی عادت سی ہوجاتی ہے''۔

بعد میں پوچھا:

''درد بھی ہوتا ہے؟''

مدنی صاحب نے کہا:

''جس پیر میں چوٹ لگی ہے اس میں زیادہ درد نہیں ہے ان دنوں زیادہ تر فانٹومیک کا درد ہے''۔

اچانک سجاد بستر سے اٹھا اور حیران ہو کر پوچھا:

''کیا؟ بابا آپ کے پاس فانتوم ہے؟''

حسین جو کہ سجاد کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے آہستہ سے سجاد کے کان میں کہا

''یہ فانٹومیک درد کی بات ہو رہی ہے نہ کہ فانتوم''

لیکن سجاد جو یہ بات سمجھ نہیں پایا تھا کہا:

''فانتوم ایک جنگی جہاز ہے میں جانتا ہوں''۔

حسین نے آہستہ سے سجاد کے کہنی ماری اور کہا:

''تمہارے باپ فانٹومیک درد کی بات کر رہے ہیں یعنی خیالی درد نہ کہ فانتوم''۔

مدنی صاحب ہنسے اور بیٹے سے کہا:

''بیٹا فانٹومیک درد یعنی جسم کے کٹے ہوئے اعضا میں درد ہونا۔ وہ لوگ جن کا ہاتھ یا پاؤں وغیرہ کٹ جاتا ہے تو اس میں کئی برسوں تک درد ہوتا ہے... یعنی احساس ہوتا ہے کہ درد ہو رہا ہے؟''

''احساس کرتے ہیں۔ لیکن کیسا احساس۔ کبھی کبھی اس کا درد اصل درد سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے''۔

حسین کی ماں نے سجاد کی ماں سے کہا:

''رحمت صاحب شدت درد کی بنا پر اکثر راتوں میں سو نہیں پاتے۔ مجبور ہو کر کٹے ہوئے پیر کو ہلاتے ہیں اور کبھی کبھی تو برش یا ہتھوڑی سے ٹانگ لگانے والی جگہ پر مارتے ہیں تا کہ تھوڑا درد کم ہو جائے''۔

حسین کی ماں نے رحمت صاحب کی طرف مڑ کر کہا جو سر نیچے جھکائے بیٹھے تھے:

''کبھی کبھی تو راتوں میں تین تین لوگوں کے رونے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ رحمت صاحب کے اتنا شدید درد ہوتا ہے کہ آنکھوں میں آنسوں جمع ہو جاتے ہیں اس وقت فاطمہ اور حسین بھی رونے لگتے ہیں''۔

حسین نے سجاد سے کہا:

''اب آیا سمجھ میں فانٹو میک کیا ہے!''

سجاد نے کہا:

''ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا بابا کے پاس فانتوم جہاز ہے اور شاید ہم اس پر سوار ہوں گے''۔

حسین نے کہا:

''خواب دیکھا ہے۔ مبارک ہو''۔

سجاد نے کہا:

''اب سمجھا کہ کیوں کبھی کبھی رات کو بابا چیختے ہیں، فریاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مرحوم پیر کی وجہ سے ہے''۔

بعد میں بابا سے پوچھا:

''یہ درد کب ٹھیک ہوگا؟''

مدنی صاحب نے کہا:

''ڈاکٹروں کے مختلف نظریات ہیں سب کی رائے ایک نہیں ہے۔ کچھ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پیر کے کٹنے سے پہلے کی عمر کے برابر وقت لگتا ہے۔یعنی جس وقت میرا پیر کٹا تھا میں پچیس سال کا تھا۔اب مجھ کو اتنا ہی انتظار کرنا پڑے گا تا کہ درد ٹھیک ہوجائے۔یعنی یہ درد پچاس برس کی عمر تک ہمارا مہمان رہے گا''۔

سجاد نے کہا:

''اوہو! اتنا زیادہ!''

رحمت صاحب نے کہا:

''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ فانٹومیک دردیاد اور حافظہ سے تعلق رکھتا ہے۔اپنے دماغ کو بہت زیادہ قابو میں رکھ کر کٹے ہوئے اعضا کی یاد کو مٹا دیا جائے تب کہیں جا کر یہ درد ختم ہوتا ہے''۔

اسی وقت مریم خانم ایک سینی میں چائے بنا کر لے آئیں اور چائے کی خوشبو سے کمرے کی فضا معطر ہوگئی۔

رحمت صاحب نے بات بدلتے ہوئے سجاد سے کہا:

''سنا ہے کہ تم نے اسکول میں کمال کر رکھا ہے اور اسکول میں بچوں کے لئے شعر کہہ رہے ہو؟''

سجاد نے کہا:

''شعر امی نے کہے تھے''۔

مریم خانم نے کہا:

''میں شاعرہ تو نہیں ہوں۔لیکن جب محسن صاحب بچوں کے ساتھ پہاڑ پر گئے تھے تو میں نے سوچا کہ ایک پیر سے پہاڑ پر چڑھنا بہت

مشکل ہے۔ لہذا اس سلسلے میں کچھ لکھوں تا کہ بچوں کے لئے درس کوشش اور امید بن سکے۔ شہید بادپا کی بیوی پہلے ہی اس کام کو انجام دے چکی تھیں۔ مختصر یہ کہ میں نے دیکھا کہ جو چیز میں لکھ رہی ہوں آہستہ آہستہ وہ شعر کے مانند ہوتی جارہی ہے۔ بچوں کے شعر کی طرح۔ علوی صاحب جو ایک اچھے شاعر ہیں انہوں نے زحمت کی اور اصلاح فرمائی''۔

حسین کی ماں نے کہا:

''واہ ! واہ! بہت اچھا ! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہمارے پڑوسی شاعر بھی ہیں''۔

مریم خانم نے کہا:

''ارے! کیوں شرمندہ کررہی ہیں''۔

حسین کی ماں نے کہا:

''ہاں یہ بتایئے پروین خانم کیسی ہیں؟''

مریم خانم نے کہا:

''کون پروین خانم؟''

''پروین اعتصامی! کیا آپس میں مٹنگ نہیں ہوئی؟''

سب کے سب ہنسنے لگے۔ مریم خانم نے کہا:

''یہ شعر میں نے برادرم شہید علی اکبر بادپا کو تقدیم کئے ہیں''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''بیٹے سجاد! اپنی ماما کے شعر ہم لوگوں کو پڑھ کر سناؤ''۔

سجاد نے بنا کسی تاخیر کے شعر پڑھنا شروع کردیے:

یُک روز جمعہ ہمراہ بابا
رفتیم از کوہ بالای بالا
مانند گلہا در کوہ و بستان
بودیم باہم شاداب و خنداں
بابا جلو بود مانند آہو
ما می دویدیم پشت سر او
بابا اگرچہ یک پا ندارد
از کوہ رفتن پروا ندارد
جمعہ کے دن ہم با با کو لیکر
پربت پہ پہنچے اوپر سے اوپر
پھولوں کی صورت پربت، چمن میں
تھے ہم بھی اک ساتھ ہنستے ہنساتے
بابا تھے آگے جیسے کے ہرن ہو
ہم دوڑتے تھے خوب ان کے پیچھے
یہ سچ ہے بابا ایک پیر کے تھے
پربت پہ چڑھنے کی ہمت بہت تھی

حسین کی ماں نے کہا:

''واہ! واہ! شاعرہ کی سلامتی کے لئے صلوات!''

سب نے صلوات بھیجی۔ کمرے کی فضا خوشبو سے معطر ہوگئی۔ رحمت صاحب نے کہا:

''جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ آج شب جمعہ ہے ہم لوگوں نے صلوات بھیجی لیکن شہیدوں کی روح، شہید بادپا اور محمد رحیم اور امام کی روح

کے لئے ایک اور صلوات"۔

سب نے صلوات بھیجی۔ پورا گھر گلاب جیسی خوشبو سے مہک اٹھا۔اس کے بعد گھنٹی کی آواز کانوں میں آئی۔

مدنی صاحب نے کہا:

"سمیہ جان دیکھو کون ہے"۔

سمیہ گئی اور واپس آئی اور بابا سے کہا:

"وہی صاحب ہیں جو آج عصر کے وقت آپ کی عیادت کے لئے آئے تھے"۔

مدنی صاحب نے کہا:

"اندر بلا لو"۔

سمیہ گئی اور رضا صاحب کی آواز آئی۔

"یا اللہ صاحب خانہ کی اجازت ہے"۔

محسن صاحب نے بلند آواز میں کہا اندر تشریف لایئے۔رضائی صاحب اپنی چار سالہ بیٹی نرگس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور سلام علیکم کہا۔

مدنی صاحب نے کہا:

"باقی لوگ کہاں ہیں؟ عصر کے وقت جب آئے تھے تو لوگ زیادہ تھے"

رضائی صاحب نے کہا:

"بار بار اچھا نہیں لگتا۔عصر کے وقت تو آپ کو زحمت دے ہی چکے ہیں اور..."

مدنی صاحب نے کہا:

"جتنی مرتبہ تشریف لایئے آپ کے قدم ہماری آنکھوں پر۔یعنی ہم کو خوشی ہوگی اور یہ ثواب کا کام ہے"۔

اس کے بعد مدنی صاحب نے رضائی صاحب اور رحمت صاحب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور خیریت پوچھی۔

رضائی صاحب نے کہا:

''میرے دوبارہ سے حاضر ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ جس وقت سے ہم یہاں سے گئے ہیں نرگس مسلسل اصرار کررہی ہے اور کہتی ہے کہ تم بھی سجاد کے بابا کی طرح اپنا پیر الگ کرو''۔

مدنی صاحب نے کہا:

''کیا مطلب؟''

رضائی صاحب نے کہا:

''یہ بہت زیادہ اصرار کررہی ہے کہ اپنے پیر کو الگ کردو۔ اس نے تمہارے نقلی پیر کو الماری کے پاس رکھا دیکھا ہے''۔

مدنی صاحب نے کہا:

''شاید نقلی پیر سے ڈر گئی ہے''۔

''پہلے ڈر گئی تھی لیکن بعد میں عادت سی ہوگئی اچھا لگنے لگا اب بھی کہتی ہے بابا اپنے نقلی پیر کو جدا کیجیے۔ میں اس قدر اس کو سمجھا تا ہوں اور تفصیل سے بتا تا ہوں لیکن یہ نہیں مانتی۔ مسلسل میرے پیر کو کھینچتی ہے اور اپنے خیال میں پیر کو الگ کرنا چاہتی ہے''۔

مدنی صاحب نے نرگس سے کہا:

''نرگس خانم! ایسا لگتا ہے تم بھی صدام کی نائب ہوگئی ہو؟ شام ہی سے مجھ سے چپک گئی ہے اور بالکل نہیں چھوڑتی۔ میں نے کہا آؤ چلیں چچا

محسن سے پوچھیں کہ یہ جدا ہوسکتا ہے کہ نہیں؟''

مدنی صاحب نے سوچ کر کہا:

''نرگس جان! میں تم کو ایک کام بتا تا ہوں۔ اگر تم نے اس کو پورا کر دیا تو میں تمہارے بابا سے کہوں گا کہ اپنا پیر جدا کر لیں''۔

نرگس نے کہا:

''کیا کام؟''

مدنی صاحب نے کہا:

''ایک کام جو بہت آسان ہے۔ اپنی آنکھوں کو دونوں لبوں کے درمیان رکھو۔

''بابا! انکل پریشان کر رہے ہیں''۔

''ایک بار کوشش کرو''۔

نرگس نے منھ کھولا اور نیچے کے دانتوں کی بتی کو سیدھی جانب کی آنکھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جب یقین ہوگیا کہ نہیں ہوسکتا تو ہاتھ سے سیدھی جانب کی آنکھ کو منہ کے قریب کرنے کی کوشش کی۔ بچے اس کا چہرے دیکھ کر ہنسنے لگے۔

''نہیں ہوسکتا!''

مدنی صاحب نے کہا:

''ایک منٹ صبر کرو۔ ابھی میں خود اس کام کو کرتا ہوں۔ دیکھو پیچھے کیا ہے''۔

پھر انہوں نے اپنا چہرہ پیچھے کی طرف کیا اور نقلی آنکھ کو آنکھ کے پیالہ سے نکالا۔ اور دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھا۔ پھر نرگس کی طرف پلٹے نرگس کی ایک چیخ نکل گئی۔ رضائی صاحب نے کہا:

''اب دو مشکلیں ہوگئی۔ہم آئے تھے اس لئے کہ آپ مشکل کا حل بتائیں گے لیکن آپ نے تو ایک نئی مشکل پیدا کردی۔اب گھر پہنچتے ہی یہ کہیں گی اپنی آنکھوں کو بھی نکالو''۔

مریم خانم نرگس کو باورچی خانہ میں لے گئیں۔ان کے بولنے کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔

مدنی صاحب نے حاضرین کو بتایا۔ جنگ کے آخری دنوں کے دوران ایک رات میں اور رحمت صاحب کسی ساتھی کے گھر مہمان تھے۔چوبیس لوگ ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔بہت اچھی بیٹھک چل رہی تھی سب مزہ کررہے تھے۔ان میں سے اسوقت تین لوگ شہدا کی فہرست میں ہیں اور وہ جنت میں خدا کے مہمان ہیں۔ایک جانباز تھا کہ جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔اس رات کسی نے اس کے نقلی ہاتھ کو کھینچا، ہاتھ نکل گیا۔اس کے بعد صاحب خانہ کی بیٹی آئی اوراس نے دوسرے ہاتھ کو کھینچنا شروع کیا۔ہرچند کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی آخر میں رونا شروع کیا۔

رحمت صاحب نے ہنستے ہوئے کہا:

''شاید تمہیں یاد ہو۔صاحب خانہ کے بیٹے نے بھی کمرے کا دروازہ کھولا اور میرے اکیلے جوتے کو سب کو دکھایا اور کہا یہ کس کا جوتا ہے، اس کا دوسرا جوتا نہیں ہے۔اس کے بعد سب ہنسنے لگے''۔

مدنی صاحب نے کہا:

''وہ جنگ کے زمانے کی عجیب بات تھی''۔

رحمت صاحب نے حسرت سے کہا:

جنگ کے بچے بھی کیا عجیب بچے تھے۔سب کے سب...''

مدنی صاحب نے کہا:

''مثلاً خود اپنا علی اکبر''۔

سجاد نے تعجب سے کہا:

''بابا! کیا بچے بھی جنگ کے لئے گئے تھے؟''

''نہیں بیٹا! میرا مقصد مجاہد سپاہی سے ہے۔ ہاں علی اکبر تو حقیقت میں عجوبہ تھا''۔

حسین نے کہا:

''وہ کس طرح؟''

رحمت صاحب نے جواب دیا:

''اتفاق سے میرے پاس اس سے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہے''۔

حسین نے کہا:

''پھر کیوں آپ نے ابھی چند منٹ پہلے ان کے لئے صلوات بھجوائی؟ میں نے ایک فاتحہ بھی ان کے لئے پڑھی کیونکہ میں نے سوچا کہ آپ کے بہت اچھے دوست رہے ہونگے''۔

باپ نے کہا:

''تم نے اچھا کام کیا''۔

حسین نے کہا:

''لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ میں ان کو نہیں جانتا''۔

باپ نے کہا:

''شہید بادپا مریم خانم کے بھائی تھے اور انہیں مدنی صاحب کے گروپ میں تھے''۔

حسین نے کہا:

''کیافائدہ؟ چلو اب اپنے گھر چلتے ہیں۔ اب یہاں ٹھرنے کی مجھ میں طاقت نہیں''۔

باپ نے کہا:

''لیکن میں نے ان کی روح کی خوشی کے لئے ایک صلوات بھجوائی تا کہ محسن صاحب ان کا کوئی واقعہ بیان کریں اس کے بعد زحمت تمام کرتے ہیں کیونکہ بہت دیر ہوگئی''۔

تقوائی صاحب نے اپنا چہرہ مدنی صاحب کی طرف کیا اور کہا:

''محسن جان کوئی واقعہ بیان کرو تا کہ نشست برخاست کی جائے''۔

حسین نے کہا:

''بابا جان! میں تھک گیا بہتر ہے کہ جلدی چلیں اور گاڑی کا اسٹیرنگ میرے ہاتھ میں دے دیں''۔

محسن صاحب کے لبوں پر جنبش ہوئی اور انہوں نے شہید بادپا کہ لئے فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد ان سے کہا:

''لیکن واقعہ بیان کرنے کے لئے ایک شرط ہے''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم محسن صاحب سے کسی کام کو کہیں اور وہ شرط نہ رکھیں۔ چلو بچوں دیر ہوگئی نہیں سننا''۔

رضائی صاحب نے کہا:

''نہیں تقوائی صاحب اجازت دیجئے دیکھیں کہ شرط کیا ہے''۔

مدنی صاحب نے کہا:

''اور دوسری صلوات کی شرط کے ساتھ''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''میرے پیارے عزیز اگر پہلے سے بتادیتے میں تین بار صلوات بھیجوا دیتا''۔

دوبارہ سے مردوں، عورتوں اور بچوں کی صلوات کی آواز نے پورے کمرے کی فضا کو خوشبو سے معطر کردیا۔

مدنی صاحب نے کہا:

خدا ان کی مغفرت کرے۔ بہت مذاقیہ شخص تھا۔ کبھی کبھی وہ نشیلے لوگوں کی ایکٹنگ کرتا اور اس طرح کرتا گویا کہ ایک بہت ماہر شرابی ہو اور اس نے اپنی ایک عمر اسی کام میں صرف کی ہو۔ کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ جب کہ وہ ایم اے تھا۔ شروع میں جب بنی صدر نے رضا کاروں اور سپاہ کے لوگوں کے میدان جنگ میں جانے کی مخالفت کی تھی تو وہ ایک رضا کار کی حیثیت سے میدان جنگ میں آیا تھا۔ اسکی ٹانگ زانوں کے نیچے سے کٹ گئی تھی۔ ان سالوں جنگ کے شروع میں لفظ بسیجی زبانوں پر عام نہیں تھا۔ ان کو ان پڑھ اور نامنظم سربازوں سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ جس کے کمانڈر شہید چمران تھے۔ شہید بادپا بتاتے تھے کہ ایک دن پیدل خیابان نواب کی طرف جارہا تھا ایک نیلے رنگ کی پیکان نے میرے ٹکر ماردی اور میں گر پڑا۔ اس ایکسیڈنٹ میں کہیں چوٹ نہیں آئی۔ لیکن میں زمین پر گر گیا۔ میرا نقلی پیر الگ ہوکر اس طرف گرا۔ پیکان کا ڈرائیور ضعیف العمر تھا۔ جلدی سے گاڑی سے باہر نکلا اور جیسے ہی میرے الگ ہوئے پیر کو دیکھا اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کوٹنا شروع کیا اور کہا وائے بے چارہ ہوگیا میں نے سوچا کیا مصیبت میری وجہ سے اس جوان پر آ گئی۔

مختصر یہ کہ شہید بادپا نے اس سے کہا بابا جان بے چارے تو تھے ہی اب بد بخت بھی ہوگئے۔

اس ضعیف العمر نے جب یہ دیکھا کہ شہید بادپا گریہ وفریاد کچھ نہیں کررہا ہے تو خود ہمت کرکے بولا:

''تم کہاں ہو؟ آگے کیوں نہیں دیکھتے؟''

علی اکبر بادپا نے ایکٹنگ شروع کی اور اپنے کو بالکل بے حال بنادیا۔ ڈرائیور ڈر گیا اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا:

''ذرا مدد کیجئے جلدی سے اسے اسپتال لے چلیں۔ بس اب یہ کچھ دیر کا مہمان ہے''۔

جب علی اکبر کو گاڑی میں بٹھایا تو اس نے کہا اس نقلی پیر کو بھی لے آتے۔ وہ بوڑھا شخص مجمع کو چیرتا ہوا اس کے پیر کی طرف گیا اور جیسے ہی پیر پر ہاتھ لگایا تو دیکھا وہ پلاسٹیک کا ہے۔ جب وہ واپس آیا تو دیکھتا ہے کہ یہ جناب خوش وخرم گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ علی اکبر نے کہا:

''تم نے شاید سوچا کہ کسی معمولی آدمی کا ایکسی ڈینٹ کردیا۔ جلدی کرو مجھے اسپتال کے بجائے گھر پہنچاؤ''۔

بوڑھے نے کہا:

''خدا انصاف کرے۔ نہ جانے تم کس طرح کے انسان ہو؟''

علی اکبر نے کہا:

''تمہاری نظر میں یہ کونسا ماڈل ہے؟''

اس نے جواباً کہا:

''ماڈل سے کیا مراد ہے؟''

علی اکبر نے کہا:

''اس پیر کا ماڈل''۔

پیرمرد نے کہا:

''تم نے تو مجھے پریشان کردیا اب بتاؤ کہ حضرت کہاں تشریف لے جائیں گے تا کہ میں پہنچادوں؟''

علی اکبر نے کہا:

''دماوند پہاڑ کی چوٹی پر۔لیکن راستے میں الوند اور تفتان کی چوٹیوں پر بھی ہوتے چلیں گے''۔

علی اکبر نے کہا:

''پیر کا ماڈل نہیں بتایا اب میں بتا تا ہوں اس پیر کا ماڈل بانسٹھ ہے اور آپ کی گاڑی کے ماڈل سے بڑا ہے اور یہ پیر جو ٹھیک ہے اس کا ماڈل بتیس ہے''۔مختصر یہ کہ پوری طرح اس پیرمرد کے ساتھ مزہ کیا۔

مدنی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا علی اکبر نے اس قدر اس پیرمرد کے ساتھ مذاق کیا کہ ایکسیڈینٹ کی پریشانی کو بھول گیا اس کے بعد نقلی پیر پہنا اور خداحافظی کرنے کے بعد گاڑی سے اتر گیا۔

مریم خانم کہ جو نرگس کے ساتھ کمرے میں تھیں کہا: دو سال کے بعد جب وہ شہید ہوگیا اور جس وقت جنازہ لایا گیا نقلی پیر بھی اس کے ساتھ تھا اور اسے اسی پیر کے ساتھ دفن کیا گیا۔علی اکبر کی وصیت تھی کہ پیر کو میرے ساتھ دفن کرنا۔شاید اس دنیا میں بھی کام آئے۔علی اکبر اتنا خوش مزاج تھا۔

حسین کی ماں نے کہا:

''شہید کی روح کی خوشی کے لئے صلوات بھیجئے''۔

سب نے بلند آواز میں صلوات بھیجی اب حرم جانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ خداحافظی کے وقت مدنی صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور دروازہ تک آئے اور رحمت

صاحب کے ساتھ چلنے لگے اور ان لوگوں کے عصا سے چار کی ردیف سی بن گئی تھی۔

حسین اوپر نیچے کود رہا تھا:

''بابا حرم نہیں جائیں گے؟''

''نہیں''۔

باپ نے حسین کی خوشی کا عالم دیکھا تو تعجب کیا اور حسین نے کہا:

''مجھے کفشداری کو جوتے دینے کے لئے نہیں جانا پڑے گا اس لئے میں خوش ہوں۔ آج میں اپنی ڈیوٹی سے آزاد ہوں''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''غلطی کی اگر ہم حرم جاتے تو فیملی گیٹ سے جاتے اور تم پھر بھی آزاد ہوتے''۔

''ٹھیک ہے۔ معاف کیجئے غلطی ہوئی۔ چلیں حرم''۔

''اب دیر ہوگئی۔ خدا نے چاہا تو آیندہ ہفتہ''۔

☆

مدنی صاحب کی مہمانی کو ایک ہفتہ ہوگیا۔ حسین اب بھی جوتے، کفشداروں اور عصا کی فکر ہی میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک دن ایک جوڑ عصے کے ساتھ کفشداروں کے سامنے جائے تا کہ یہ دیکھے کہ کفشدار اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

دوپہر کے بعد اس نے اپنی سائیکل نکالی تا کہ وہ گلی میں چلائے۔ تھوڑی دیر میں اس نے سجاد کو دیکھا وہ بھی سائیکل پر تھا۔ اس نے اپنی سائیکل کے ہینڈل کو سجاد کی طرف موڑا اور سجاد کی سائیکل کے سامنے بریک لگایا اور ٹھیک سائیکل کے سامنے کھڑا ہوا۔

''سلام سجاد''

''سلام ٹھیک ہو؟''

''تم ٹھیک ہو یا نہیں کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں''۔

حسین سائیکل سے اترا اور سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر سجاد سے کہا:

''سجاد تم سے ایک سوال ہے''۔

''پوچھو''

''جس وقت تم اپنے بابا کے ساتھ حرم جاتے ہو تو کیسے اپنے بابا کا جوتا کنفشدار کو دیتے ہو؟''

''ہم سب خود اپنے اپنے جوتے دیتے ہیں''۔

''الگ الگ جاتے ہو یا ایک ساتھ؟''

''جتنے بھی افراد ہوتے ہیں سب ساتھ جاتے ہیں۔ کس لئے معلوم کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں''۔

''بولو تو صحیح کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟''

حسین نے اپنا سر نیچے کیا اور کہا:

''تیرے بابا کا ایک جوتا تیرے لئے دردسر نہیں بنا؟''

سجاد نے ہنس کر کہا:

''یہی چاہتے تھے؟ کیوں البتہ دردسر تو نہیں لیکن کوئی بات تو ہے''۔

حسین نے سجاد کے چہرے کو غور سے دیکھا اور کہا:

''کیا بتاؤں؟''

''کبھی کبھی حرم سے واپسی میں بابا اپنا ٹوکن مجھے دے دیتے ہیں تا کہ میں جوتے لے آؤں۔ کنفشدار تمام جوتوں کو میز پر رکھ دیتا ہے۔ پھر دیکھتا ہے ان میں سب جوڑے ہیں اور ایک تنہا۔ پھر واپس جا کر خانوں میں جوتے

تلاش کرتا ہے اور جب وہاں نہیں ملتا ہے تو زمین پر دیکھتا ہے۔جب وہ ناامید ہوجاتا ہے تو پوچھتا ہے مطمئن ہو ایک جوڑا تھا؟

پھر میں ان سے مذاق کرتا ہوں۔

حسین نے پوچھا:

''کیا مطلب؟''

سجاد نے کہا میں ان سے کہتا ہوں کہ جناب اس ایک جوتے کو دے دیجیے میرے ماں باپ انتظار کررہے ہیں۔وہ کفشدار کہتا ہے تم مطمئن ہو کہ ایک جوڑ دیے تھے؟

میں کہتا ہوں:

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ جوتے دیجیے''۔

کفشدار دوبارہ تلاش کرنا شروع کردیتا ہے لیکن پھر بھی نہیں ملتا پھر وہ کہتا ہے لگتا ہے یہ ایک ہی جوڑ تھے۔پھر بابا آجاتے ہیں۔کفشدار جب ان کے ہاتھ میں عصا دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے بابا کہتے ہیں:

''تو نے ابھی تک اپنی حرکت چھوڑی نہیں؟ کیوں ان حضرت کو پریشان کرتے ہو؟ جناب میں معذرت چاہتا ہوں''۔

میں بھی کفشدار سے کہتا ہوں:

''اس مرتبہ جاتا ہوں لیکن اگلی مرتبہ...''

حسین نے تھوڑا سوچا اور کہا:

''ابھی تک ایسا نہیں ہوا کہ تم نے بابا کا جوتا کفشدار کی تحویل میں دیا ہو؟''

''کیوں؟ کبھی کبھی ہوا ہے''۔

''تمہارے لئے یہ چیز مشکل نہ تھی''۔

''مشکل نہیں لیکن''

''یعنی پھر کیا ہوتا؟''

''مثلاً کبھی کبھی پوچھتا ہے کیوں بس ایک جوتا ہے؟''

میں جواب دیتا:

''کیا تم نے ابھی تک ایک پیر کا انسان نہیں دیکھا ہے؟''

حسین تعجب سے کہتا ہے:

''تمہاری ہمت کی داد دینی پڑے گی''۔

سجاد نے ہنس کر کہا:

''مگر اس میں کیا مشکل ہے؟''

''تو اسے پریشان کرتا ہے نہ کہ وہ تجھے''

''میں جوتے واپس لیتے وقت انتظار کرتا ہوں کہ یہ پہلے والا کنفشدار بدل جائے اور دوسرا آجائے تا کہ وہ اس موضوع سے بے خبر ہو اور پھر میں اس سے دوسرا جوتا مانگوں''۔

''بہت اچھا''۔

''کبھی تو وہ سمجھ جاتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں جا کسی بڑے کے ساتھ آ۔ یعنی وہ مجھ کو پریشان کرتے ہیں جب تک بابا کو نہیں لاتا وہ جوتے نہیں دیتے''۔

حسین نے خوش ہو کر کہا:

''اس سلسلے میں میں ایک بات تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں''۔

سجاد حسین کے پروگرام کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔

''تو ایک پیر سے حرم جانا چاہتا ہے''۔

سجاد بہت عقلمند اور ہوشیار تھا اسکول میں بھی اس کا کوئی مد مقابل نہیں تھا تو حید انٹر کالج کے بچوں کو یہ معلوم تھا کہ اسکا باپ جانباز ہے۔ سجاد جنگ سے متعلق تمام باتوں کو جو اس نے باپ سے سنی تھیں کلاس میں بچوں اور معلموں کو بتاتا تھا۔ تمام بچوں کو یہ معلوم تھا کہ اس کے باپ کا ایک پیر کس طرح جنگ میں شہید ہوا۔ سب جانتے تھے کہ اس کا بابا تخریب چی یعنی بموں کو ناکارہ بنانے والے گروہ سے تھا۔ سجاد بچوں کو بتاتا تھا کہ اس کے بابا کا پیر ایک دھماکے میں ران سے کٹ گیا اور بائیں آنکھ کی بینائی بھی ختم ہوگئی۔

حسین کو سجاد کی یہ بے توجہی اور شرمیلا نہ ہونا اچھا لگا۔ لیکن وہ خود کلاس میں اس طرح کی بات نہیں کرسکتا تھا وہ صرف سجاد کے ساتھ ہی اپنے دل کا درد بانٹ سکتا تھا۔

''میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا پلان تمہیں اچھا لگا یا نہیں؟''

''کون سا پلان؟''

دونوں نے اپنی اپنی سائیکلوں کو دیوار سے ٹکادیا۔

''میں ایک دن دو بیساکھیوں کے سہارے حرم جانا چاہتا ہوں۔ تیری کیا رائے ہے؟''

''باپ کے ساتھ''

''باپ نہیں معلوم''۔

جواب قطعی نہیں دے سکتا۔ شاید اپنے باپ کے ہمراہ جائیں۔ بیساکھی کہاں سے لاؤگے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ باپ کے سامنے اس طرح کی حرکت کرسکو۔

''ان تمام چیزوں کے بارے میں میں نے نہیں سوچا تھا۔ اب جو سوچا تو دیکھا کہ باپ کے سامنے اس طرح کا کام مشکل ہے''۔

''نہیں بابا کے ساتھ نہیں جاؤنگا۔ تو گھر آجانا ہم لوگ ساتھ چلیں گے''۔

سجاد نے پوچھا:

''تمہارے بیساکھی کے سہارے جانے کی وجہ کیا ہے؟''

حسین نے جواب دیا:

''میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم ایک بار اس اکیلے جوتے کو وہ کسی چون و چرا کے بغیر مجھ سے لے لے''۔

''کون سا جوتا ؟''

''اکیلا جوتا''۔

خود اپنی بات کو کاٹتے ہوئے اچانک یاد آیا کہ اگر بیساکھیوں کے سہارے حرم جاؤں گا تو خود میرے ایک جوڑ جوتے بھی تو ہوں گے۔

''جواب نہیں دیا''۔

''بابا کا ایک جوتا''۔

''تو تم اپنے جوتوں کا کیا کرو گے؟''

حسین نے کہا:

''اپنے ایک جوڑ جوتے کو علیحدہ علیحدہ گیلری میں دونوں جانب ڈال دوں گا اور بابا کا جوتا کفشدار کو دے دوں گا''۔

سجاد نے کہا:

''کفشدار فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ کسی بزرگ کا جوتا ہے نہ کہ تیرا''۔

حسین نے کہا:

''کوئی بات نہیں''۔

سجاد نے کہا:

''اگر اس نے پوچھا کہ یہ کس کا جوتا ہے تو تو کیا بتائے گا؟''

حسین نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا:

''آہ! یہ عجیب سوچ ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے''۔

سجاد نے پوچھا: کیوں؟''

حسین نے کہا:

''میں ان کفشداروں کے سوالات سے بچنا چاہتا تھا لیکن میرا یہ پلان بھی ناکام ہوگیا''۔

سجاد نے کہا:

''اپنے ایک پیر کو اوپر اٹھا اور ایک جوتے سے حرم تک جا''۔

حسین نے کہا:

''گھر سے حرم تک کیا کروں؟''

سجاد نے پوچھا:

''کس چیز کا کیا کرے گا؟''

حسین نے کہا:

''چھوڑو، نقشہ ہی بے نقشہ ہوگیا''۔

''چھوڑو چھوڑو۔ لیکن میرے پاس اس سے بہتر سوچ ہے''۔

''کیا؟''

''میرے والد کا بایاں پیر نہیں ہے... میں جانتا ہوں''

''تیرے بابا کا سیدھا پیر نہیں ہے''۔

''ٹھیک پھر کیا؟''

''آؤ ہم لوگ عہد کریں کہ جب تم حرم جاؤ گے تو میں اور میرے بابا بھی تمہارے ساتھ آئیں گے تو اس وقت چار لوگوں کے تین جوڑ جوتے

ہو جائیں گے اور وہ کنفشدار کو دے دیں گے"۔

"بہت اچھی فکر ہے۔ حسین نے خوشی سے چیخنا شروع کیا اور سجاد کے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو واقعا بہت عقلمند ہے تیرے اس چھوٹے سے سر میں نہ جانے کیا ہے!"

سجاد نے کہا:

"حالات کے موافق ہے؟"

حسین نے کہا:

"کیوں نہیں؟ صرف حرم جانے کا وقت معین کریں"۔

☆

ایک ہفتہ گزرا۔ حسین اور سجاد نے آپس میں حرم جانے کا ایک وقت معین کیا۔ جس وقت ان کی گاڑیاں جانبازوں کی مخصوص پارکنگ میں جا کر رکیں اس وقت حسین خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ سجاد کے والد نے اپنی پیکان گاڑی کے اسٹیرنگ کو مقفل کیا حسین نے ہمیشہ کی طرح اپنا کام انجام دیا اور حرم کی طرف چل دیے۔

سجاد نے اپنے والد سے کہا:

"بابا! آپ اور رحمت صاحب اس دروازے سے حرم میں داخل ہونا ادھر بھیڑ کم ہے"۔

"ضروری نہیں ہے۔ ہم سب ایک ساتھ چلیں گے"۔

"آخر کار حسین نے مجھ سے کہا کہ اس کے والد ہمیشہ اس دروازہ سے جاتے ہیں تم ان کے ساتھ نہیں جاؤ گے؟"

اس نے جواب دیا:

''رحمت انکل کو تنہا نہیں چھوڑوں گا''۔

''تو پھر اپنے جوتے مجھے دے دیجئے''۔

''اطاعت سجاد آغا''۔

حسین نے بھی اس نئی تدبیر سے خوش ہو کر کہا:

''بہت بہت شکریہ جناب مدنی صاحب''

سجاد کے والد نے ان کی خوشی کو دیکھ کر تعجب سے کہا:

''بہت بہت شکریہ''۔

حسین بہت خوش تھا۔ سجاد کی عقلمندی سے اور بھی خوش ہو گیا۔ اگر کوئی مشکل تھی تو وہ یہ کہ حرم میں ایک ساتھ جانے کا وقت طے کرنا تھا۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ سجاد اور اس کے ماں باپ ایک ساتھ نا منظم یعنی کبھی کبھی زیارت کو جاتے تھے لیکن حسین کے گھر زیادہ تر مہمان رہتے تھے۔ حسین کی ماں مجبور تھیں کہ فاطمہ کے ساتھ گھر کے کاموں کے لئے گھر ہی میں رہیں اسی وجہ سے حسین اپنے والد کے ساتھ جاتا تھا۔

اسی لئے سجاد نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اس پلان کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اب حسین فخر کے ساتھ تین جوڑ جوتے دے کر بنا کسی چون و چرا کے ٹوکن لے لینا چاہتا ہے۔ جب کفشداری کی میز کے قریب پہنچے تو اس کے اپنے جوتوں کے علاوہ بابا کا جوتا بھی ہاتھ میں تھا۔ سجاد کا بھی یہی حال تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے جوتے کفشداری کی میز پر رکھے۔ حسین نے کہا:

''تیرے بابا کا اکیلا جوتا کہاں ہے؟''

''لو''۔

لیکن ان میں سے ایک کالے رنگ کا جوتا تھا اور وہ دوسری چپل سبز رنگ کی سفید تلوے کے ساتھ۔

حسین حیران رہ گیا۔ اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ہنسے یا روئے۔ اس شخص کی طرح سے جیسے کوئی پہاڑ سے واپس آنے کے بعد بے حال ہوتا ہے۔ اس کی قوت کسی کام کو کرنے یا کوئی بات کہنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ ہاتھ کو ہلا سکے۔ اس میں اتنی قوت نہیں تھی کہ اس جوتے کو میز پر رکھ سکے یا زمین پر چھوڑے۔

اپنے آپ سے کہا یہ عجیب غلطی کی اور کفشداران کو دیکھیں گے تو دو جوتوں کو الگ الگ تلاش کریں گے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سجاد تو دیوانہ ہے!

اب سجاد نے سوچا کیا کریں۔ اس نے فوراً پلاسٹک کی ایک کالے رنگ کی تھیلی نکالی اور جوتے اس میں ڈالے اب چھ جوتے اس تھیلی میں تھے اور کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

''جناب... جناب''۔

''فرمایئے''۔

''یہ جوتے ہیں لے لیجئے''۔

''اچھا قربان لایئے صاحب زادہ مجھے دے دیجئے دعا کا طالب ہوں''۔

حسین نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا:

''تو بھی کیا عجیب آدمی ہے۔ اگر میری برابر کا ہوگا تو نہ معلوم کیا غضب ڈھائے گا''۔

سجاد نے کہا:

''پھر کیا؟ تو تو صرف اپنے باپ کا ایک پیر ہے لیکن میں اپنے باپ کا ایک پیر اور ایک آنکھ بھی ہوں''۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور حرم میں داخل ہوگئے۔ حسین اپنے آپ سے کہہ رہا تھا:

''کیوں ابھی تک میں نے اس طرح نہیں سوچا ؟ اب اس کے بعد میں بھی یہ کام کرسکتا ہوں ایک پلاسٹک کی تھیلی لاؤں اور اس میں جوتے رکھ کر کفشدار کو دے دوں اور آرام وسکون سے حرم میں داخل ہو جاؤں''۔

گھر پہنچنے تک حسین اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ آیندہ ہفتے اپنے ساتھ پلاسٹک کی تھیلی لائیگا۔

جمعہ کے دن حسین اور سجاد کی ملاقات پھر گلی میں ہوئی۔ حسین نے پوچھا: سجاد کیا تم نے اس سلسلے میں سوچا کہ دونوں کے جوتے ایک طرح کے ہوں تا کہ ایک ساتھ ایک جوڑ جوتے کفشدار کی تحویل دیے جاسکیں۔

''مجھ سے کیا مطلب!''

''تمہارا ہی پلان تھا عقلمند خان!''

''حقیقتا تیرا ہی قصور تھا کہ میرا پلان فیل ہوا''۔

''تیرے ہی والد کی غلطی تھی''۔

''باپ کی بات بیچ میں نہ لاؤ''۔

''پریشان مت ہو ٹھیک کہہ رہا ہوں کہ تمہارے والد نے اپنی دی ہوئی رائے پر عمل نہیں کیا''۔

حسین نے تھوڑا سوچا اور کہا:

''کیا رائے دی تھی کیا مشورہ ہوا تھا؟''

سجاد نے کہا:

''پارسال جب بابا کی آنکھ میں مشکل پیش آئی تھی اور وہ مجبوراً ایک ہفتے گھر پر آرام کررہے تھے تو تمہارے والد ہمارے گھر آئے اور بابا سے کہا:

''محسن صاحب کیا آپ روزانہ نقلی پیر پہنتے ہیں؟''

میرے بابا نے کہا نہیں، اگر میں روزانہ پہنتا ہوں تو کمر میں درد ہونے لگتا ہے۔ کبھی پہنتا ہوں اور کبھی نہیں پہنتا۔

تیرے والد نے بھی کہا:

''میں بھی اگر روزانہ پہنوں تو کمر کی ڈسک میں مشکل ہوتی ہے''۔

حسین نے کہا اگر ہر روز نقلی پیر لگاتے تو کوئی مشکل پیش نہ آتی پھر تو ایک جوڑ جوتے ہوتے۔

سجاد نے کہا:

''بہت زیادہ خوش نہ ہو اگر تمہارے بابا نقلی پیر بھی پہنتے تب بھی دونوں جوتے ایک جیسے نہ ہوتے''۔

''کیوں؟''

''کیونکہ ایک جوتا نیا ہوتا اور دوسرا پرانا سا۔ میرے بابا کے بھی ایسے ہی جوتے ہیں''۔

''اتفاق سے میرے بابا کے بھی ایسے ہی جوتے ہیں''۔

''تجھے معلوم ہے اس طرح کیوں ہو جاتے ہیں''۔

حسین نے تھوڑا سوچا اور کہا:

''ہاں کیونکہ نقلی پیر مڑتا نہیں ہے اور ویسا ہی رہتا ہے لیکن اصلی پیر میں حرکت ہوتی ہے اور وہ مڑتا ہے''۔

سجاد نے کہا:

''یہ مجھے نہیں معلوم تھا میں نے اس سلسلے میں سوچا نہیں تھا''۔

حسین نے اس بارے میں سوچا کہ نقلی پیر جوتے کو نیا رکھتا ہے۔ لیکن جوراب کو ایڑی سے پھاڑ دیتا ہے۔ بابا جس وقت موزے خریدتے ہیں تو تین جوڑ خریدتے ہیں۔

چار پانچ ماہ میں نقلی پیر میں چار موزے کام میں آتے اور دو موزے اصل پیر میں۔

اس کے بعد حسین نے کہا:

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ بابا نے کیا مشورہ دیا تھا''۔

سجاد نے کہا:

''تیرے والد نے میرے والد سے پوچھا: آپ کے پیر کا نمبر کیا ہے''۔

بابا نے کہا:

''بیالیس''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''کتنا اچھا ہوا''۔

میرے والد نے پوچھا:

''کیا اچھا ہوا؟''

''رحمت صاحب نے کہا میرے جوتے کا نمبر بھی بیالیس ہے''۔

میرے والد نے کہا:

''پھر ہم لوگ ہم فکر ہیں''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''نہیں جناب اس کا کوئی تعلق ہم فکری سے نہیں ہے''۔

میرے بابا نے کہا:

''ٹھیک کہتے ہو''

رحمت صاحب نے کہا:

''پریشان نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک مشورہ دوں''۔

بابا نے کہا:

''فرمایئے''۔

رحمت صاحب نے کہا:

''آؤ دونوں مل کر تین جوڑ جوتے خرید لیتے ہیں اور ہم لوگ اس میں سے تین تین جوتے رکھ لیتے ہیں''۔

پہلے بابا نے تعجب کیا لیکن رحمت صاحب نے کہا کہ آپ تو خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ قدرتی پیر کے جوتے جلدی خراب ہوتے ہیں۔

بابا نے رحمت صاحب کو آفرین کہا۔صرف یہ سوال کیا کہ کیا ہم لوگ اپنے لئے ایک ایک جوتا نہیں خرید سکتے ؟تیرے باپ نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا پہلی بات تو یہ کہ ایک جوتا ملتا ہی نہیں اور اگر مل جائے تو موچی بیچتے نہیں۔ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی ایک جوتا بیچتا ہے تو اس کی بیوی مرجاتی ہے۔میرے باپ نے کہا عجیب مسخرہ اعتقاد ہے۔اب کیا کریں۔

تیرے باپ نے کہا صرف وہی راہ ہے جو میں نے بتائی۔حسین نے کہا:ایک بار اور اس بات کو جو بابا نے بتائی ہے تفصیل سے بتانا۔

سجاد نے کہا:

''یعنی تین جوڑ موزے خریدتے ہیں۔ان میں سے ایک نقلی پیر کے لئے اور دو اصل پیر کے لئے یعنی میرے بابا دو سیدھے پیر کے لئے اور ایک بائیں پیر کے لئے۔تیرے بابا دو بائیں پیر کے لئے اور ایک سیدھے پیر کے لئے۔وہ بین الاقوامی بات یہ تھی''۔

''لیکن فائدہ؟اس چیز پر عمل نہیں ہوا''۔

''اے بے انصافوں اگر عمل کیا ہوتا تو مجھے کنھداروں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا''۔

سجاد نے چالاکی سے ہنستے ہوئے کہا:

''ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ دوبارہ سے ان کو اس مشورے پر عمل کرنے کو کہیں۔ پھر ہم اطمینان کی سانس لے سکیں گے''۔

حسین نے کہا:

''وہ کنفشدار جس کا قد چھوٹا ہے کبھی پریشان نہیں کرے گا''۔

''کون سا''۔

''وہی چھوٹے قد والے جناب کہ جن کے بال بکھرے رہتے ہیں وہ کبھی نہیں پوچھتا۔ جب وہ کنفشداری پر ہوتا ہے میں بہت اطمینان سے رہتا ہوں۔ اتفاق اس کے برعکس! میں جب بھی بابا کے جوتے لینے کے لئے آتا ہوں وہ صاحب جن کے بارے میں تو بتا رہا ہے وہ ہوشیار ہے۔ ایک بار میں چاہتا تھا کہ اسے پریشان کروں تو اس نے کہا: اس مرتبہ تم یہ تنہا ایک جوتا لے لو ان شاء اللہ۔ اس کے بعد تمہارے بابا کے لئے ایک جوڑ خریدوں گا۔ حسین نے کہا ایسا لگتا ہے کہ شاید وہ خود جانباز ہے''۔

حسین اس خیال میں تھا کہ کیوں وہ سجاد کی طرح نہیں ہے۔ کیوں میں خود مشکل حل نہیں کرسکتا ہوں۔ کاش میں بھی بہادر ہوتا اور اتنا شرمیلا نہیں ہوتا کاش میں اپنی بات صحیح طرح سے سمجھا سکتا۔

پھر اس نے ارادہ کیا اور سجاد کی طرف منہ کر کے کہا: میں جاتا ہوں اور اپنی نقاشی کو بدلتا ہوں۔

''کون سی نقاشی؟''

سجاد نے کوئی بہت زیادہ توجہ حسین کی بات پر نہیں کی اس لئے دوبارہ پوچھا:

''کون سی نقاشی؟''

''بعد میں ملاقات کروں گا''۔

سنیچر کو اسکول میں حسین نے دو نقاشی سجاد کو دیکھائیں۔ پہلی والی ایک ہفتہ قبل بنائی تھی اور دوسری کل۔ پہلی نقاشی میں ایک جوڑ جوتے تھے۔لیکن دوسری نقاشی میں زیادہ جوتے تھے۔ دوسو تین سے بھی زیادہ۔ جوتوں سے کاغذ بھرا ہوا تھا۔ان جوتوں کے درمیان ایک بڑا جوتا تھا۔اگر دور سے نقاشی کو دیکھئے تو ضرور ایک جوتا دیکھائی دیتا تھا۔وہی بڑا جوتا۔جو بہت ہی خوبصورت رنگوں سے سجا ہوا تھا۔

ڈاکٹر سید کلیم اصغر

ڈاکٹر سید کلیم اصغر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں جن کا تعلق صوبۂ اترپردیش کے مشہور و معروف تاریخی شہر سنبھل ضلع مرادآباد سے ہے۔

ابتدائی تعلیم سنبھل میں حاصل کی۔اس کے بعد لکھنو جاکر ۱۹۹۲ء میں شیعہ پی جی کالج سے بی اے کیا۔۱۹۹۴ء میں لکھنو یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔۱۹۹۷ء میں حکومت ایران کی جانب سے ایم اے/پی ایچ ڈی اسکالرشپ کے لئے منتخب کیا گیا۔ ایران میں امام خمینی انٹرنیشنل یونیورسٹی قزوین سے چھ ماہ کا لینگویج کورس کرنے کے بعد تہران یونیورسٹی تہران آ گئے۔سن ۲۰۰۰ میں دوبارہ ایم اے اور ۲۰۰۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔آپ کے مقالے کو ۲۰۰۲ کا سب سے بہترین مقالہ قرار دیتے ہوئے ایرانین پارلیمنٹ لائبریری کی جانب سے گولڈ میڈل اور سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔

حال ہی میں آپ کا تصحیح کردہ مشہور و معروف تذکرہ شاعران فارسی سفینہ خوشگو دفتر دوم ایرانین پارلیمنٹ لائبریری سے شایع کیا گیا ہے جو کہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اسی تذکرہ کا دفتر سوم بھی اسی لائبریری میں اشاعت کی منزلوں میں ہے۔اس کے علاوہ تقریباً ۴۰ مضامین ایران، پاکستان اور ہندوستان کے معیاری رسائل میں شایع ہو چکے ہیں اور تقریبا اتنے ہی قومی اور بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کر کے اپنے تحقیقی اور تنقیدی مقالات بھی پیش کر چکے ہیں۔۲۰۰۶ میں آپ کو فارسی ادب کی خدمات پر اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند اے پی جے عبدالکلام کے ہاتھوں راشٹر پتی بھون میں ''مہرشی بادراین ویاس'' اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے۔